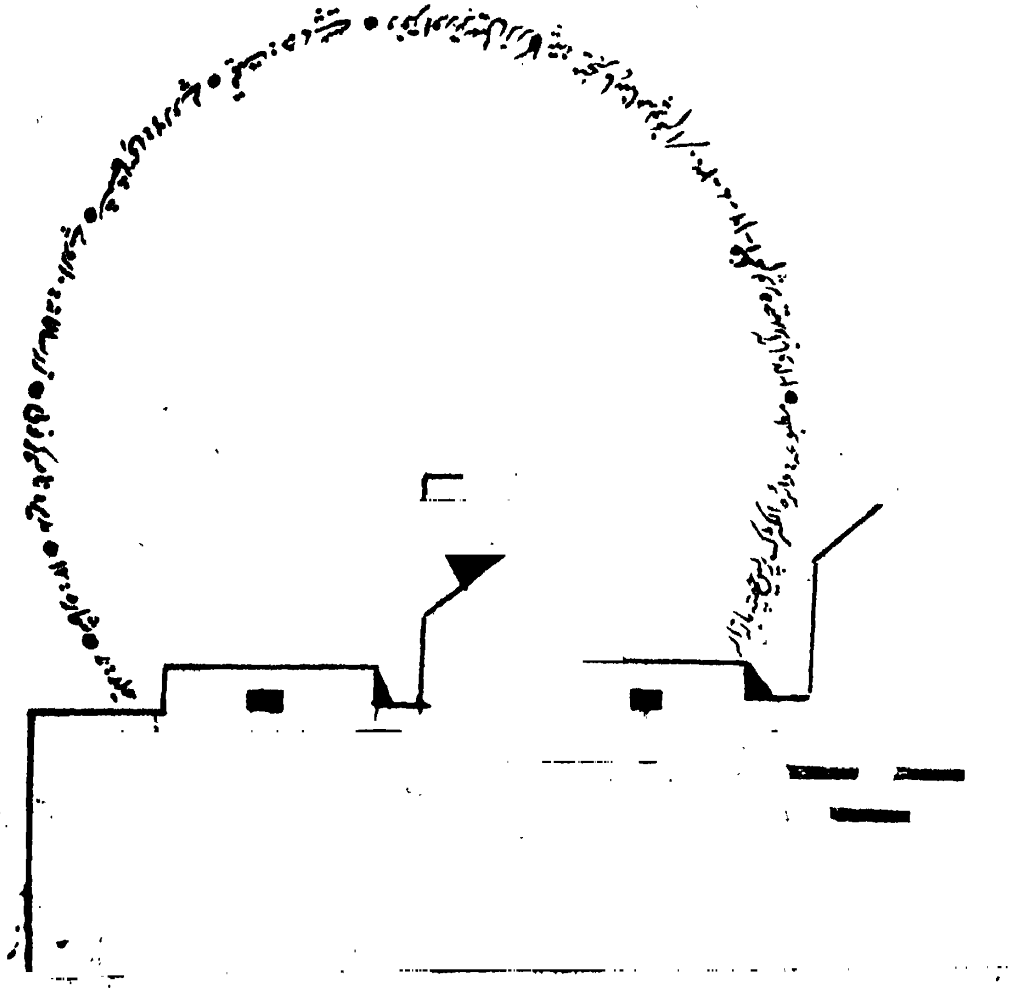


مارچ ۱۹۷۱ء
ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر
مہ کرنولی ایم ۔ اے عثمانیہ

فہرست

مضامین:

نوٹس انعام یافتہ

انگولا کے لیڈر اور شاعر ۔ اگوسٹینا نیٹو ۔

(ادارہ)

ماں !

(سیاہ فام مائیں جن کے لڑکے جدا ہوگئے)
تم نے مجھے صبر کرنے اور امید پر جینے کا سبق دیا ہے ۔
وہ سبق جسے تم نے مشکلات اور مصائب کے دور میں سیکھا تھا ۔
مگر میری زندگی میں موہوم امیدوں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے ۔
میرا کام انتظار کرنا نہیں ہے ۔
بلکہ میں وہ ہوں جس کا زمانہ منتظر ہے ۔
اور ہم جو تمہارے بچے ہیں ایک ایسے مسلک کی جانب بڑھ رہے ہیں
جو زندگی کو بقا عطا کرے گا ۔
ہم تمہارے وہ گیت ہیں
جنھیں زندگی کی تلاش ہے ۔

(ایک افریقی شاعر کا اعلان) اگوسٹینا نیٹو ۔

اگوسٹینا نیٹو ۱۹۲۲ء میں بمقام اکولای (انگولا) میں پیدا ہوا ۔ لسبن میں گریجویشن کر لینے کے بعد ملک میں اپنا مطب قائم کیا ۔ بعد ازاں انگولا کی اس تحریک میں سرگرمی سے حصہ لینا شروع کیا جس کا مقصد ملکی تہذیب کی بازیافت تھا ۱۹۶۰ء میں نیٹو کو انگولا کی جدوجہد آزادی کی تحریک کا صدر بنالیا گیا ۔ لیکن اسی سال نیٹو کو قید کر لیا گیا اور اس نے قید کی معیاد کا کچھ حصہ لسبن میں گزارا ۔ اس کے بعد ۱۹۶۲ء میں جیل سے بچ نکل بھاگنے میں کامیابی حاصل کی اور دوبارہ تحریک کی قیادت سنبھال لی ۔ اس کی نظمیں پرتگال اور انگولا میں شائع ہوتی رہیں ۔

۱۹۶۰ء کے تازہ ترین سرکاری اعداد و شمار کی رو سے انگولا کی آبادی (۵۰) پچاس لاکھ سے زیادہ افراد پر مشتمل ہے ۔ جن میں ایک اندازے کے مطابق ۴،۷۵،۰۰۰ آفریقی ہیں جن کو خوف زدہ کر کے ان کا استحصال ۳،۵۰،۰۰۰ یورپین (جن میں ۸۰،۰۰۰ سپاہی بھی شامل ہیں) کرتے ہیں ۔
ابتدا ہی سے پرتگالی نوآبادکاروں کا رویہ وحشیانہ نسلی امتیازات اور استحصال پر مبنی رہا ہے جو انسانی حقوق اور وقار کے تعلق سے انتہائی قابل نفرت ہے ۔ پانچ صدیوں تک اس وحشیانہ ، انسان دشمن طاقتوں سے انگولا عوام کو نمٹنا پڑا ۔ اس کے بعد جدوجہدی کی تحریک کے ذریعہ عوام نے ملک

کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لے لی۔ انگولن عوام جدوجہد آزادی تحریک کی موثر رہنمائی میں از سر نو بیدار ہوئے اور ان کا جاگا ہوا وقار بیرونی قبضہ و اقتدار کو ختم کرنے پر تل گیا۔

نیتو جیسے روشن خیال شاعر اور سرفروش دانشور کی قیادت کی اہمیت صاف واضح ہو جاتی ہے جب ہم اس حقیقت کو پیش نظر رکھیں کہ پرتگالی نوآبادکار جو قدیم طرز نوآبادکاری کی انتہائی ظالمانہ طاقتوں کی نمائندگی کرتے ہے۔ انگولا کی تحریک آزادی کو کچلنے کے لئے ہر امکانی طریقہ اور جدید ترین وسائل سے کام لے رہا ہے۔ جس میں پولیس کے دہشت انگیز فاشسٹ طریقوں سے لے کر خفیہ سراغ رسانی، سازشی اسلحہ دہشت انگیزی سائیکو سوشیل (PSYCHO-SOCIAL) اقدامات شامل ہیں۔ جن کا مقصد درحقیقت انگولا کے عوام کو پوری طرح سے غلط راستہ پر ڈال کر سرے سے ان کی ذہنیت کو بدل ڈالنا ہے۔

مفتوں کوٹوی

ثابت لکھنوی مرحوم

ثابت لکھنوی مرحوم کا نام (مولوی) افضل حسین تھا۔ ۱۸۶۲ء میں بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے۔ وہیں تربیت و تعلیم حاصل کی۔ جدوجہد آزادی ۱۸۵۷ء کے اثرات مابعد کی زد میں آکر ترکِ وطن پر مجبور ہوئے۔ ۱۸ سال کی عمر یعنی ۱۸۸۰ء میں لکھنؤ سے کوٹہ (راجستھان) میں آئے۔ تمام عمر یہیں رہے۔ بسلسلۂ معاش ملازمت اور بعد ازاں وکالت رہا۔ ۱۹۴۱ء میں ۷۹ سال کی عمر میں یہیں (کوٹہ ہی میں) داعئ اجل کو لبیک کہا۔ کیا خوب فرما گئے ہیں۔

کیا زور کسی عہد کا مولا سے چلے
محروم ہم اس باغِ تمنا سے چلے
افسوس کہ سرد گرمِ عالم سہہ کر
جب رہنے کے قابل ہوئے دنیا سے چلے

ایک رباعی اسی مضمون کی اور ہے

آزاد ہوئے تو شادکامی نہ رہی
گھبرا اٹھے روح جب غلامی نہ رہی
کامل جو بشر ہوا، اجل آ پہنچی
بوسیدہ ثمر ہوا، خامی نہ رہی

"حیاتِ دبیر" انھیں کی تصنیف ہے۔ نیز حیاتِ دبیر حصۂ دوم جلد اول بھی، صبرِ جمیل (تاریخی نام۔ برقِ غم) (۱۳۱۱ھ) ان کے کلام کا مجموعہ ہے۔ دربارِ حسین بھی ان کی مشہور تصنیف ہے جس میں شاگردانِ مرزا دبیر کے حالات، ان کے نمونۂ کلام کے ساتھ درج ہیں۔ کوٹہ کا ادبی ماحول ان کی خدمت و محنت سے بڑا پربہار رہا ہے۔

زندگی تین حصوں میں تقسیم ہے۔ طفلی، شباب، اور پیری۔ ہمارے شعراء نے ہر حصۂ حیات پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ "لے لے شباب دے دے پروردگار بچپن" کہہ کر طفلی کی یاد تازہ کی ہے۔ یہ شعر بھی اسی سلسلے سے وابستہ ہے۔

اسیرِ پنجۂ عہدِ شباب کر کے مجھے
کہاں گیا مرا بچپن خراب کر کے مجھے

جوانی، دیوانی کا ذکر اردو شاعروں نے بڑی قیامت آفرینیوں اور ہنگامہ خیزیوں کے ساتھ کیا ہے

نام کیا ہے اسی ہنگامہ کا آغازِ شباب
ایک آندھی سی چلی آتی ہے ارمانوں کی!

(نہال سیوہاروی)

کمبخت جوانی سینے میں ناگن کی طرح لہراتی ہے۔

ہر موجِ نفس اک طوفاں ہے، کونین شکن ارمانوں کا (جوش)

جوانی رخصت ہو چکی ہے۔ اب اس کی یاد میں رو رہے ہیں۔

ہم دیر تلک بیٹھ کے رو لیتے ہیں
کہنے لگتے ہیں جوانی کی کہانی جو کبھی (شاد عظیم آبادی)

ریاضؔ اب کہاں وہ جوانی کا عالم
گلے سے لگاتے جوانی جو ملتی (ریاضؔ)

ثاقبؔ مرحوم، وجدانِ شعری کے ساتھ نگاہِ حقیقت بیں اور دلِ انجام شناس رکھتے تھے، وہ شباب کی رخصت سے اور بڑھاپے کی آمد سے .... واقف تھے۔ ان کا یہ شعر ملاحظہ کیجئے۔

ضعفِ پیری نہیں دینے کا اماں آپ سے آپ
جائیگا سوئے نشیب آبِ رواں آپ سے آپ

چنانچہ شباب کے چلے جانے کا ذکر ان کے یہاں بڑے متین لب و لہجہ اور بڑے پرسکون اطوار و انداز سے ہے۔

گزری جوانی اور جوانی کے ولولے
اک چاند تھا کہ ڈوب گیا چاندنی کے ساتھ

ہر خوشی کا باغِ عالم میں تباہی ہے مآل
کھلکھلا کر جب ہنسیں کلیاں، پریشاں ہو گئیں

پیا نہیں شباب نے پھر خود بھی چل دیا
رہتا نہیں ہے کوئی ہمیشہ کسی کے ساتھ

شباب بڑھاپے میں تبدیل ہو رہا تھا۔ اس وقت بھی ان کی آواز میں باخبری اور بیداری تھی۔ ایک شعر اور رباعی دیکھیے۔

چھلا پہر ہے چونک تغافل کے خواب سے
پیرا بدل رہا ہے بڑھاپا شباب سے

طفلی جو گئی دل سے آ تھوڑا امیرا
پھر قلبِ شباب نے بھی توڑا میرا
ممنون بڑھاپے کا ہوں میں تو ثاقبؔ
مرتے مرتے ساتھ نہ چھوڑا میرا

یہ پُر وقار و خوشگوار انداز اس وقت میسر آتا ہے جب انسان ہر مشکل کے لئے تیار اور ہر حادثہ کے لئے آمادہ ہو، وہ جبھی موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال سکتا ہے جب مرنے سے بے باک نہ ہو، زندگی اور اس کی رنگینیوں میں زیادہ مستغرق نہ ہو۔ باہمہ و بے ہمہ انداز سے عمر بسر کر رہا ہو۔ مرحوم تصنّع تکلف کی لاحاصلی پر بھی نظر رکھتے تھے۔ بڑھاپے کے سلسلہ میں خضاب انہیں قطعاً گوارا نہیں۔ موئے سفید پر رنگ آمیزی وہ بالکل پسند نہیں کرتے، ملاحظہ کیجئے۔

خضاب میں جو بہارِ شباب دیکھتے ہیں
شباب دیکھتے ہیں یا وہ خواب دیکھتے ہیں
پیری مقابلہ کو چلی تھی شباب سے
رسوا و روسیہ ہوئی آخر خضاب سے

ذیل کی دو رباعیاں بھی اسی بیزاری و ناگواری کی مظہر ہیں۔ انداز بیان شاعرانہ ہے اور یقیناً دلکش و دلپذیر بھی۔

دل توڑا گناہوں کی گراں باری نے
نیرنگ دکھائے چرخِ زنگاری نے
پوشیدہ نہیں سیاہ بالوں میں سفید
نیکی کو چھپایا ہے سیہ کاری نے

اچھا نہیں انجام ستمگاری کا
اندازہ نہ سیکھ چرخِ زنگاری کا
اچھا نہیں بار بار بالوں میں خضاب
جم جائے نہ پھر زنگ سیہ کاری کا

اس لاحاصلی بیزاری اور ناگواری کا مظاہرہ ایک جگہ اور پیش کیا جا رہا ہے۔ کیا موتیوں میں تولنے کے قابل رباعی کہی ہے۔

دنداں ٹوٹے کہ ہائے ٹوٹے موتی
رہزن تھا بڑھاپا جس نے لوٹے موتی
ہنو ہاے دانت بھی تو کیا ہوتا ہے
سچے تھا کو پہونچتے نہیں جھوٹے موتی

ان کی واقعہ پرستی اور حقیقت پروری یقیناً خدا کی دین تھی جسے محکمۂ عدلیہ کی ملازمت نے اور دو آتشہ کر دیا تھا۔ ملازمت کے بعد وکالت ذریعۂ معاش بنی۔ قانونی دماغ وہم و گمان سے دور رہتا ہے۔ حقائق و واقعات سے وابستگی رکھتا ہے۔ بڑھاپا حقیقت بن کر آیا تو شبابِ رفتہ کی یاد اور اس کا تصور انہیں کیوں فریب میں رکھتا۔ یقیناً حقیقت پیشِ نظر رہی۔ شبابِ رفتہ افسانہ بن گیا تھا۔ اسے بھلا دینا پڑا۔

روزِ عشرت کی دوپہر یاد نہیں
ہے ذہن میں مبتدا خبر یاد نہیں
پیری میں ہے یہ شبابِ رفتہ کا خیال
شیریں تھا بہت خواب مگر یاد نہیں

زندگی کے حادثات، عوام کی نظروں سے دوسرے طریق پر دیکھے جاتے ہیں۔ شاعر کا اندازِ دید اپنا جداگانہ ہوتا ہے۔ وہ انہیں اپنی شاعرانہ اور بصیرت مندانہ نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ جوانی اور بڑھاپے کے آثار کو مرحوم نے اپنی خصوصی نظروں سے دیکھا ہے، اس مشاہدہ میں ان کی اپنی انفرادیت آشکارا ہے۔

زمانہ کی ترقی و تنزل کا یہ خاکہ ہے
جوانی میں مہاسے وقتِ پیری جھریاں ہونا

بڑھاپے کی جھریاں اور برگزیدہ شاعروں کے یہاں ملاحظہ فرمائیے۔

کل ہم آئینے میں رخ کی جھریاں دیکھا کئے
کاروانِ عمرِ رفتہ کا نشاں دیکھا کئے (صفی لکھنوی)

یہ جھریاں نہیں ہاتھوں میں ضعفِ پیری نے
چنا ہے جامۂ اصلی کی آستینوں کو (میر انیس)

اسی ضمن میں ثابت مرحوم کا یہ شعر بھی یقیناً پسند آئیگا۔

ضروری ہے بڑھاپے میں ضعیف و ناتواں ہونا
یہ پیری کی موجیں ہیں بدن پر جھریاں ہونا

ثابت مرحوم کا یہ اندازِ بیان۔ یہ متعین تخاطب، یہ پُر وقار لہجہ یہ ٹھہرا ہوا، اور پُرسکون طریقۂ اظہار، بڑی بصیرت، بڑی بیباکی اور بڑی فرزانگی و دانائی کا حامل ہے۔ کارِ آگہی نہ شعور اور جراتمندانہ فراست کا آئینہ دار ہے اور یقیناً

این سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

بڑھاپا موت کی تیاری اور آمادگی کا زمانہ ہے۔ اگرچہ موت کے لئے عمر کا کوئی حصہ یا وقت متعین نہیں۔ لیکن ثابت مرحوم پختہ عمری اور کہنہ سالی میں ہم سے رخصت ہوئے ہیں۔ اس لئے ان کے بڑھاپے کا ذکر کرنا پڑا تاکہ ان کے ذکرِ پیری میں موت کی آمادگی ہونے، نہ ہونے کا اظہار ہو جائے۔ بڑھاپے کے متعلق ان کی اور بھی بہترین رباعیاں ہیں اور میں انہیں قارئین کی دلچسپی کے لئے درج کرنا بھی چاہتا تھا۔ لیکن مضمون کی طوالت کا اندیشہ بھی ہے اور یہ اس موضوع سے براہِ راست متعلق بھی نہیں۔ صرف ذیل کی رباعی دیکھئے جس میں موت کی تیاری کا عکس جھلکتا ہے۔

تکلیف اٹھائی حفظِ نفسانی سے
سمجھا دشمن کو دوست نادانی سے
ضعفِ پیری کی قدر کر اب تو ثابت
تن سے نکلے گی جان آسانی سے

ضعفِ پیری مظہر ہے کہ آبِ رواں، نشیب کی طرف جا رہا ہے۔ موت ان کے یہاں سوچی سمجھی چیز ہے۔ یہ ہمہ وقت اس کیلئے آمادہ ہیں۔ یہ شعر ملاحظہ کیجئے۔

لازمی باتوں میں ثابت انتشار و وہم کیوں؟
موت آنے کے لئے ہے جان جانے کے لئے

موت پر ان کا ایمان و ایقان ان رباعیوں سے ظاہر ہوگا۔ سبھی جانتے ہیں کہ موت برحق ہے۔ لیکن اس کی آمادگی کی ترغیب، قبر کو یاد رکھنے کی تلقین، ان رباعیوں میں دیکھنے کی چیز ہے۔ اندازِ بیان تاکید کا انداز رسمی نہیں، سنجیدگی لئے ہوئے ہے۔

پیری کی جو لے زورِ جوانی سے بڑھی

دینے کو اجل سرائے فانی سے بڑھی
برزخ کے زمانے کا ہوا جبکہ حساب
مدت مرنے کی زندگانی سے بڑھی

ہر شئے دنیا کی ایک دن فانی ہے
حیران ہوں کیوں دل کو پریشانی ہے
ہے قید حیات نام اس ہستی کا
زندہ جو شخص ہے وہ زندانی ہے

انسان سے زمیں کا شکم بھرنا ہے
ہشیار کہ دور کا سفر کرنا ہے
ہوتا نہیں کیوں غیر کی میت میں شریک
آخر تجھ کو بھی ایک دن مرنا ہے

سرکشی یہ غرور و غیظ سب بیجا ہے
تو آگ نہ بن کہ خاک کا پتلا ہے
ملنا ہے اسی خاک میں اک دن تجھ کو
آخر کو بڑے بول کا سر نیچا ہے

ایک رباعی اور پیش کروں گا جو مرحوم نے طاعون کے زمانہ میں کہی تھی۔ غور فرمائیے اس تلقین میں کیا چیز پوشیدہ ہے اور تلقین کرنے والا کن جذبات سے مملو ہے۔

گیروں سے پلنگ کے عبث ڈرتا ہے
موت آنے سے پہلے خوف سے مرتا ہے
کوٹھی سے نکالا کہ گل نہ ہو شمع حیات
غافل! جو کرتا ہے، خدا کرتا ہے

قبر کی یاد آوری اور لحد کی تیاری کے ضمن میں یہ اشعار بھی توجہ چاہتے ہیں۔

کسی کی بات بھی تو پوچھتا نہیں منعم
ترے خیال میں کیا پرسش مزار نہیں

گھر بناتا ہے تو منعم کر لحد کا بھی خیال
کچھ خبر ہے تجھ کو، یہ در پیش منزل اور ہے

ثابت مرحوم نے یہ شعر خود اپنے لئے تازیانۂ عبرت کے طور پر کہا ہے۔ لیکن ہم بھی اس سے بصیرت حاصل کر سکتے ہیں۔

بیٹھے پڑے ہیں سمجھ پہ فراموش ہے لحد
مہمان سرائے دہر کو میں گھر سمجھتا ہوں

ضعف پیری اب امان نہیں دے رہا ہے۔ کچھ دن میں عمر کی ترکی تمام ہونا چاہتی ہے۔ ملک الموت بہادر کی اب آمد آمد ہے۔

پیری میں کہاں نشان تیور کی ہے
کچھ دن میں تمام عمر کی ترکی ہے
رعشہ نہ سمجھ موت کا ڈر غالب ہے
آمد ملک الموت بہادر کی ہے

موت سے قبل نزع کا عالم طاری ہے۔

جب نزع میں موت کا ستارا چمکا
شہباز نفس بھر کے طرارا چمکا
آنسو بہہ کر چھپ نہیں ہے رخ پر
صبح شب زندگی کا تارا چمکا

اس نزع کی رباعی میں جو چمک دمک ہے، وہ یقین کی کتنی قندیلیں روشن رکھتی ہے؟ اضطرار و اضطراب کا کہیں شائبہ نظر آتا ہے؟ شاعرانہ انداز بیان نے اس سخت مرحلہ کو کتنا تابان درخشاں کر دیا ہے۔ ایک رباعی اور۔

پیری میں جوانی کا پلٹنا معلوم
ڈھلتی ہوئی دھوپ کا سمٹنا معلوم
دیتے ہیں عبث نزع میں شربت احباب
ٹلنی اجل کا اس سے گھٹنا معلوم

شاعرانہ انداز بیان نے رباعی میں کیا خوبی پیدا کر دی ہے! پیری میں جوانی کا پلٹنا معلوم، اسی حقیقت پسندی اور صداقت آرائی کا مظہر ہے، جس کا اظہار مرحوم کی دیگر رباعیوں اور دوسرے شعروں میں اوپر آ چکا ہے۔ قدرتی نظارہ کو استعارہ کے طور استعمال کرنے سے مرحوم کی قوت مشاہدہ واضح ہے۔

شباب کے متعلق کہا تھا۔

روزِ عشرت کی دوپہر یاد نہیں

بڑھاپے کی سفیدی کے متعلق کہا ہے۔

ڈھلتی ہوئی دھوپ کا سماں معلوم

لفظوں کا رکھ رکھاؤ۔ رعایتِ لفظی، صنعت مراعاۃ النظیر کا جابجا استعمال، دیگر معنوی و ظاہری خوبیاں، اربابِ نظر سے دادِ تحسین وصول کریں گی۔ اور مرحوم کی فن دانی، سخن سنجی اور معنی آفرینی کا اعتراف تہہ دل سے کرنا پڑے گا۔ رباعیوں میں مطالب کا اظہار۔ مرحوم کی فنی بصیرت اور ادبی قدرت کا مظہر ہے۔ پھر اسلوب ادا کی جدت اور اظہار و ابلاغ کی ندرت اس پر مزید اضافہ ہے۔ شربت پلانے سے کبھی تلخی اجل کم ہو سکتی ہے؟ کتنی آل اندیشی اور انجام بینی ہے! یہ رباعی بھی ملاحظہ کیجئے۔

کب نزع میں زیست کے مزے ملتے ہیں
کمھلائے ہوئے پھول کہیں کھلتے ہیں
ہے کوچ نہ دم حلق میں کیونکر اٹکے
نفس اور نفس باہم گلے ملتے ہیں

اس شعر پر غور کیجئے۔

نقارہ بج رہا ہے کہ ہے روح کا سفر
یٰسین کا ہے شور دمِ واپسیں بلند

کاتبِ اعمال نے انکارِ رفاقت سے انہیں یہ سکھایا تھا۔

سکھایا کاتبِ اعمال نے ہم کو رفاقت سے
مصاحب بن کے ہو اس پر نہ تم بارِ گراں ہونا

بڑھاپے نے ایک تو جاں کنی کی مشکل آسان کر دی

ضعفِ پیری کی قدر کر اب تو ثابت
تن سے نکلے گی جان آسانی سے

ضعف پیری اور ناتوانی نے دوسرا فائدہ یہ پہونچایا کہ یہ کاتب اعمال کی تعلیم پر عمل پیرا ہو سکے۔

جنازہ دوش پہ ہے جاتے ہیں احباب کیا خوش خوش
اٹھے دنیا سے جب ہم کام آیا ناتواں ہونا

کاتبِ اعمال نے تو بے کسی میں رفاقت چھوڑ دی لیکن انہوں نے ان کی تلقین و تعلیم کا حق ادا کر دیا۔

احباب کی عدم انسیت اور کاتبِ اعمال کی عدم رفاقت کا ذکر کتنے خوشگوار اسلوب سے کیا ہے۔

قبر میں رکھ کر نہ ٹھہرا کوئی دوست
خاک میں سب کی محبت مل گئی
بے کسی میں کاتبِ اعمال بھی رخصت ہوئے
رہ گئے اعمال اپنے ساتھ جانے کیلئے

یہی منظر کشی اس شعر میں ہے۔

عیال، اطفال، مال، احباب سب دنیا کے ساتھی تھے
شریکِ حال بس اعمال اپنے مرتے دم نکلے

لحد سے مخاطب ہیں۔

بس اب تو ہے اور میں فقط اے لحد
نکیرین بھی امتحاں لے گئے

یہ شعر سنئے اور ان کے انجام پر غور فرما لیجئے۔

خدا کا شکر ہے طے ہو گئی یہ زیست کی منزل
تھکا ماندہ تھا رستہ کا، ملا آرام منزل میں

ثابت مرحوم ملک الموت بہادر سے اپنے معاملات میں جس حد تک کھرے، سچے اور نڈر رہے ہیں، وہ ہمارے لئے یقیناً قابلِ تقلید ہیں۔ اور خود ان کے لئے بھی مستحقِ تحسین۔

یہ شعر اس مضمون کے خاتمہ کے لئے مناسب رہے گا۔

ستم ہائے زمیں پہ نہ بہرام رہ گیا
مردوں کا آسماں کے تلے نام رہ گیا۔

مضامین صاف اور خوشخط روانہ فرمائیے

جواب طلب امور کے جوابی کارڈ یا لفافے کا آنا ضروری ہے۔ (ادارہ)

مسعود قمر تاباں

ادب اور جنسیات

تعمیری اور افادی ادب کے لیے ضروری ہے کہ وہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کا عکاس ہو اور اجتماعی خواہشات اور صحت مند تصورات کا ترجمان نیز اس میں ادیب کا اپنا نظریہ بھی واضح ہو تو بہتر ہے۔

ادب میں ہمیشہ سے جنس بہت ہی اہم اور ضروری موضوع رہا ہے۔ دراصل جنس انسانی زندگی کا وہ پاکیزہ جذبہ ہے جس کے گرد ہر انسان کی زندگی گردش کر رہی ہے جسے ہم صنفِ ادب سے علاحدہ نہیں کر سکتے اس لیے کسی ایسے فن پارہ میں، جو تعمیری اور افادی نقطۂ نظر سے تخلیق کیا گیا ہو جنسی جذبات کا اظہار تعجب خیز یا جرم نہیں قرار دیا جا سکتا۔ فرائڈ نے جنسی قوت (LIBIDO) کو زندگی کی بنیادی شئے تسلیم کیا ہے۔ اگر ادب تخلیق کرتے وقت ہم "بداخلاقی" کے خوف سے زندگی کی بنیادی قدروں وجنسیات کو نظر انداز کر دیں، تو یہ لائقِ تحسین بات نہیں ہوگی۔ اچھا ادب وہی ہو سکتا ہے جس میں زندگی کے مختلف زاویوں اور تجربات کی مکمل طور پر ترجمانی کی گئی ہو اور جو اجتماعی خواہشات وصحت مند تصورات کا بھی حامل ہو۔

ادب کو مروّجہ اخلاقی قدروں کا پابند بنا لینا صحت مندی کی علامت نہیں کہی جا سکتی۔ یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ اخلاق کیا ہے؟ . . . . ہم دیکھتے ہیں کہ زمان و مکاں کے ساتھ ساتھ اخلاقی قدریں بھی بدلتی رہتی ہیں۔ کوئی ایسا مکمل نظامِ اخلاق ہمارے پاس موجود نہیں ہے جو ساری دنیا میں بیک وقت رائج ہو۔ ہر قوم کا اپنا ایک مخصوص کلچر ہوتا ہے جس کی بنیاد پر اس کی اخلاقی قدروں کا انحصار ہوتا ہے۔ اور ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ کسی ایک قوم میں کوئی عمل اخلاق کے دائرے میں شمار کیا جاتا ہے تو وہی کام دوسری قوم میں اخلاق سے بعید تصوّر کیا جاتا ہے۔ جس طرح مشرق و مغرب کی تہذیب و تمدّن میں زمین آسمان کا فرق ہونے کی وجہ سے اخلاقی قدریں بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اور پھر اخلاقی قدریں تغیّر پذیر ہونے کی وجہ سے کبھی ایک جگہ قائم نہیں رہتیں۔ ایسی صورت میں کسی فن پارہ کو مروّجہ اخلاق کی کسوٹی پر پرکھ کر فحش یا عریاں قرار دے دینا کبھی بھی انصاف پسندی نہیں کہی جا سکتی۔ ادب کو فحش قرار دینے کے لیے یہ اصول بھی مناسب نہیں ہوگا کہ اس میں وہ عنصر تلاش کیا جائے جس میں جنسی جذبات کی عکاسی کی گئی ہے بلکہ دیکھنا یہ چاہیے کہ یہ عکاسی کس پیرایہ میں کی گئی ہے آیا اس کا مقصد

حقیقت نگاری ہے یا محض لذت اندوزی اور بحیثیت مجموعی سماج پر اس سے کس قسم کے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

یہ فرق اسقدر باریک ہے کہ بیشتر مقامات پر عریانی اور فحاشی میں تمیز کرنا مشکل ہوجاتا ہے۔ ایک ادیب کے لئے وہ مرحلہ بہت ہی اہم اور نازک ہوتا ہے جبکہ وہ اپنے فن میں حقیقت کا رنگ بھرنے کیلئے عریاں نگاری پر مجبور ہوجاتا ہے۔ اس موقع پر انتہائی ذہانت اور فنی بصیرت کی ضرورت ہے کیونکہ عریاں نگاری ایک ایسی پگڈنڈی ہے جس کے دونوں طرف فحاشی کے گہرے گہرے کھڈ ہیں جہاں ادیب کے قلم کی معمولی سی لغزش بھی اسے فحاشی کے عمیق گڑھے میں ڈھکیل سکتی ہے۔

حقیقت نگاری کے ذیل میں عریانی کا اظہار فحاشی کے الزام سے بری ہے۔ اگر عریانی کو فحاشی کا نام دے دیا جائے تو دنیا کے تمام مذاہب کی قابلِ احترام کتابوں پر بھی عریانیت اور فحاشیت کا الزام لگایا جاسکتا ہے۔ لیکن چونکہ ان کتابوں کا مقصد کبھی بھی لذت اندوزی یا عریانیت پرستی نہیں ہوسکتا اس لئے ان کی تقدیس پر حرف گیری ناممکن ہے۔ چنانچہ حقیقت نگاری کے ذیل میں عریانی کا اظہار منفی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ لیکن اگر عریانی کا مقصد محض لذت کوشی ہے تو یقیناً وہ قابلِ مذمت ہی نہیں بلکہ فحش قرار دیا جائے گا۔ جو سماج میں جنسی انارکی پھیلانے کا موجب بن سکتا ہے۔ اسی لئے ایسے ادب کو مٹا دینا پروفیسر احتشام حسین صاحب نے ہمارا فرض قرار دیا ہے۔

کسی بھی ادب یا فن پارے کو فحش یا بامقصد قرار دینے کیلئے ہمیں کچھ اقدار متعین کرنی ہوں گی جن کی کسوٹی پر رکھ کر عریانی، فحاشی اور حقیقت نگاری کا فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس قسم کے پیمانے متعین کرنے میں اگر سماج کی مروجہ اخلاقی اقدار کو ہی مدنظر رکھا گیا تو انصاف کرنا مشکل ہوگا۔ ادب کو پرکھنے کیلئے سماج، ماحول، مسائل اور مقصد کے ساتھ ادیب کی شخصیت اور نیت کو بھی مدنظر رکھنا ضروری ہے۔

ادب کو جنس کی حیاتیاتی .. (BiOLOGiCAL) فعل سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ صرف نفسیاتی اور جذباتی پہلوؤں سے تعلق رکھتا ہے۔ فرائڈ نے ادب کو جنسی جذبے کا مظہر قرار دیا ہے اور عشق جنسی جذبے کا سب سے اعلیٰ مظہر ہونے کی وجہ سے مختلف ادوار میں ہر ملک کے ادب کا موضوع رہا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ عشق کی تقدیس کا راگ الاپنے والے عشق کو جنس سے علیحدہ کرنے پر مصر ہیں۔ حالانکہ عشق، جیسا کہ سطور بالا میں کہا جاچکا ہے جنسی جذبے کا سب سے اعلیٰ مظہر ہے جسکی بنیاد ہی جنسی جذبات پر ہی قائم ہیں۔ ایسی صورت میں عشق کو جنس سے علیحدہ کرکے اس کی تقدیس کا راگ الاپنے والے حقیقت میں جنسی کجروی کا شکار ہوکر مصنوعی زندگی بسر کرتے ہیں۔ "پاک محبت" کا یہ تصور نہ صرف فطری اعتبار سے غیر صحیح ہے بلکہ نفسیاتی نقطۂ نظر سے بھی غلط ہے۔

ادب میں جنس کا مسئلہ کافی نازک ہے۔ یہ بڑا پیچیدہ مسئلہ ہے کہ ادب میں جنس کا بیان کیا جائے یا نہیں اور اگر کیا جائے تو کس طرح؟ اس کا جواب یہی ہوسکتا ہے کہ جب زندگی اور جنس ایک دوسرے میں مدغم ہیں تو پھر ادب کو کس طرح جنس سے علیحدہ رکھا جاسکتا ہے! اب سوال صرف اندازِ بیان اور مقصد کا رہ جاتا ہے۔ اگر سطحی اور بھدے طریقے سے جنس کا بیان کیا جائیگا تو وہ یقیناً اچھے اثرات مرتب نہیں کرسکے گا۔ لیکن اگر تشبیہات و استعارات کے لطیف پردوں میں یہ بیان کیا جائے گا تو اس کی افادیت سے انکار ممکن نہیں ہوسکتا۔ جس کی کچھ مثالیں مشہور مثنوی گلزار نسیم اور سحر البیان سے دی جاسکتی ہیں جن میں وصل کے بیان کو لطیف تشبیہات اور حسین استعارات میں ظاہر کیا ہے۔

طوارِ حباب کو کیا طے
ساغر پہ جھکا وہ شیشۂ مے
(مثنوی گلزار نسیم)

لگے پینے باہم شرابِ وصال
ہوئے نخلِ امید سے وہ نہال
(مثنوی سحر البیان)

غم و درد دامن کشیدہ ہوئے
وہ گل نارسیدہ رسیدہ ہوئے
(مثنوی سحرالبیان)

ادیب کا اصل مقصد مدنظر رکھنا بھی ضروری ہے کہ عریاں نگاری کے پیچھے کون مقصد کارفرما ہے۔ اگر اس کا مقصد لذت پرستی ہے تو ایسا ادب صحت مند نہیں کہا جا سکتا۔ ادب اور زندگی میں جنس کا احترام لازمی ہے۔ اگر ادیب کے دل میں جنس کا کوئی احترام نہیں ہے تو وہ عریانیت کو جنسی تسکین کے نعم البدل میں پیش کر کے قاری کو خود تسکینی کی طرف راغب کرنے کا مرتکب ہوگا۔ برخلاف اس کے ایسا ادیب جو زندگی میں جنس کا احترام کرتا ہو کبھی بھی فحاشی اور لذت پرستی کی جانب مائل نہیں ہو سکتا۔ اس سلسلہ میں جناب مرزا عظیم بیگ چغتائی کا نام فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ جنہوں نے اردو ادب میں سب سے پہلے اس موضوع پر نہایت بے باکی سے قلم اٹھایا اور عریانی اور فحاشی کو پاس بھی نہ پھٹکنے دیا۔ اس کے برخلاف جو فنکار جنسی جذبہ کا احترام نہیں کرتا وہ اگر اس موضوع پر قلم اٹھاتا ہے تو وہ اسے ہیجان انگیز بنا دیتا ہے۔ دراصل ایسے ادیبوں کے ذہن میں جنس کا بیمار تصور ہوتا ہے جو جنسی کجروی کا شکار ہو کر "پورنوگرافی" کے ذریعہ لذت حاصل کرنے لگتے ہیں۔

ادب اور جنس کا بڑا گہرا تعلق ہوتے ہوئے بھی رشتہ بہت ہی نازک ہے۔ ایک ادیب کی ذمہ داری اس وقت کہیں زیادہ بڑھ جاتی ہے جبکہ وہ زندگی کے اس سب سے اہم جذبے (جنس) کی ترجمانی کرتا ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بڑے بڑے ادیبوں سے اس میدان میں لغزشیں ہوئی ہیں اور ان کا قلم فحاشی کی جانب مائل ہو گیا ہے۔ لیکن کسی بھی فن پارے کو صرف عریانی کی بنا پر فحش قرار دے دینا ناانصافی ہوگی۔ اگرچہ "جنسی بیمار" قسم کے ادیب زندگی کی غیر صحت مند عکاسی کرتے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ ان کے ساتھ دوسرے باشعور ادیبوں کو بھی نشانہ بنایا جائے۔ عریانی و فحاشی ان ہی لوگوں کو پسند ہو سکتی ہے جو خود جنسی انتشار پسند واقع ہوئے ہیں اور غیر صحت مند تخلیق [illegible] کرنے کے ساتھ جھوٹی شہرت کے بھی خواہاں ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسے فحش ادب کو کس طرح روکا جائے؟ اور سماج کو اس کے برے اثرات سے بچانے کے لئے کونسا طریقہ اختیار کیا جائے؟ یہاں یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ دنیا کا کوئی بھی قانون عوام کو بااخلاق نہیں بنا سکتا۔ موجودہ دور میں تقریباً ہر جگہ فحش لٹریچر پر قانونی پابندیاں عائد ہیں۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ہر قسم کا فحش ادب وافر تعداد میں کھلے عام بازاروں میں بکتی رہتی ہیں۔ اور قانون فحاشی کے سیلاب کو روکنے میں ناکام رہ جاتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اخلاقی قدریں کبھی قانون کے پیچھے نہیں چلتیں بلکہ قانون کو اخلاق کے پیچھے چلنا پڑتا ہے۔ ہمارے معاشرہ میں جنس کو شجر ممنوعہ سمجھا جاتا ہے اور عوام کو صحت مند جنسی تعلیم دینے سے گریز کیا جاتا ہے۔ جس کے نتیجہ میں جنسی تجسس شدت اختیار کر لیتا ہے اور عوام جنسی بے راہ روی پر چل پڑتے ہیں۔

نفسیاتی جائزہ لینے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اگر عوام کو جنسی اعتبار سے باشعور بنا دیا جائے تو فحش ادب کی جانب سے خود بخود ان کی رغبت ختم ہو جائے گی۔ اور آپ ہی آپ ایسا ادب ناپید ہو جائے گا جو معاشرہ اور سماج کی تباہی کا سبب بنا ہوا ہے۔ ادب سے لذت حاصل کرنا ان کے ذوق پر منحصر ہوتا ہے۔ اگر ہم ادب پر پابندیاں عائد کرنے کے بجائے عوام کا جنسی شعور بیدار کرنے کی کوشش کریں تو فحش ادب آسانی کے ساتھ ختم کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں ہمارے ادیبوں اور شاعروں پر کا یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ معاشرہ میں جنسی انتشار کو روکنے کے لئے ایسا ادب تخلیق کریں جو عوام میں جنسی ہیجان پیدا کرنے کے بجائے صحت مند جنسی شعور بیدار کرنے میں ممد و معاون ثابت ہو سکے۔

سنگریزے

ساحلِ بحرِ ذخّار کے سنگریزے
کڑی دھوپ کا بیکراں کرب اپنے دلوں میں سمیٹے ہوئے
اپنی خس پوش محرومیوں کی ردا اوڑھ کر سو گئے تھے کہ بے ساختہ
کچھ دریچے سے خوابوں کے ایوان میں کھل گئے۔
رچ رچا تی ہوئی روشنی
چھچھاتی ہوئی چاندنی
بند آنکھوں کے پردوں پہ لہرا گئی
ہر طرف نور ہی نور تھا
حلقۂ نور میں
ایک روپہلی سنہری سی جھالر جھمکتی ہوئی۔
ناچتی گاتی پریوں کے جمگھٹ
مسرت کی موجیں اچھلتی ہوئی۔

نعمت حسن

اور پھر یوں ہوا۔
خونچکاں ظلمتیں سینۂ چاک سے اپنے دوش پہ اٹھائے ہوئے
ان گنت کالی صدیوں کے ناگ
حلقۂ نور کو چیر کر
آن کی کی آنکھوں میں
روشنی پی گئیں۔
چاندنی پی گئیں۔
ساحلِ بحرِ ذخّار کے سنگریزے۔۔۔
کڑی دھوپ کا بیکراں کرب اپنے دلوں میں چھپائے ہوئے
جاگ اٹھے
پھر جلنے لگے
پھر سسکنے لگے۔

اک قدم اور

ہم کہ جس جانب چلے ہیں
لوگ اسی جانب چلے
پا بجولاں
مضمحل
الجھے ہوئے، سہمے ہوئے
زینہ زینہ
اور قدم سے تا قدم اک فاصلہ
لوگ تھے تھکتے ہوئے
پر
ہم تو بڑھتے ہی گئے
اک مرحلہ
اک حوصلہ
ذوقِ سفر کا آبلہ
تلوؤں سے تالو تک چبھن
کیسی لگن
ایسی لگن
شہرہ ہے جس کا
انجمن، ورا انجمن، ورا انجمن

وقار خلیل

بھیونڈی

دور
پگڈنڈی پہ بیٹھا
ایک کتا رو رہا ہے
ادھ جلے گھر
کارخانے
کھیت کی مٹی سے
آہوں کی طرح اٹھتا دھواں
دلہنوں کے جسم کی خوشبو کے خاکستر
براتوں کی خوشی کے راکھ کے تودے
دور تک
ہمسائیگی
پاس و مروت کی برہنہ لاش کو
مکروہ افواہوں کے گدھ
ہر طرف سے نوچتے ہیں
آئینے
ٹوٹے ہوئے
اجنبی لگتی ہے
جس میں اپنی شکل
آدمی کو
جانور کے جسم میں
پرورش کرنے تک کے
زہریلے اندھیرے فاصلے
اک پل میں کٹ چکے ہیں
دور پگڈنڈی پہ بیٹھا
ایک کتا رو رہا ہے۔

تاج مہجور

میری نسل کا المیہ

وہی ہر گام پہ تھکتے سے قدم
یاس میں ڈوبی ہوئی
وہی شاعر کی نوا
وہی افسانوں میں بے کیفی کا عالم کہ جو تھا
ناولوں میں وہی زلف و لب و رخسار کی بات

وہی ہر بات پہ کہنا کہ یہی کلجگ ہے
وہی ہر بات پہ کہنا کہ قیامت ہے قریب
وہی الزام ہر اک چیز کا تقدیر کے سر

وہی احباب
وہی مضمحل آوازیں میرے چار طرف
اسی انداز میں اصرار کہ چائے پی لو
وہی سگریٹ کا تقاضا
وہی لمبی بحثیں
وہی اترے ہوئے چہرے
وہی بیمار سے ذہن
جن کو ہر بات میں عزت کے بے لٹ جانے کا خوف،

اور کتابوں کی دوکانوں پہ وہی فلمی رسالوں کی بھیڑ
وہی کیفے وہی ہوٹل
طالب علموں کا وہی جم غفیر
بحثیں فلموں کی، سیاست کی کبھی مذہب کی
ہر طرف فکر زوال آمادہ
اپنے داداؤں کا انداز نظر
نوجوانوں کی وہ بوڑھی سوچیں

ایک دیوار گری
ایک دیوار اٹھی
جیسے کچھ بھی نہ ہوا
ایک اک چیز پہ ہے مہر روایت اب بھی
آہ یکسانیٔ حالات
یعنی بیس برس ہونے کو آئے۔ لیکن
میری دھرتی پہ کوئی ذہن نہیں بدلا ہے۔

اشرف عابدی

غزل

مسرت کی تلاش زندگی کے شہر میں
ترس رہا ہوں روشنی کو روشنی کے شہر میں
جنوں کی مدت کی تہوں میں قلزم یقین !!
مگر سراب ہے وہم و آگہی کے شہر میں
لیے چراغ جستجو، میں پھر رہا ہوں چار سو
کہ آدمی کو ڈھونڈنا ہے آدمی کے شہر میں
افق افق سحر کے نور سے دمک گیا تو کیا؟
بھٹک رہا ہوں جانے کب سے روشنی کے شہر میں
بھلا دلِ شکستہ کو کہاں سکون مل سکے؟
ہے شورشوں کا اک ہجوم خامشی کے شہر میں
نقیبِ ہوش و عقل دے رہے سنبھل سنبھل کے ہر قدم
خودی نہ کام آسکے گی بے خودی کے شہر میں
جبینِ شوق کو کہاں سے سنگِ در نصیب ہو؟
متاعِ ہوش لٹ چکی ہے بندگی کے شہر میں
شعورِ ذات کو نہ مل سکا سکوں کبھی
تمہارا غم نہ ساتھ دیتا گر خوشی کے شہر میں

کرامت علی کرامت

غزل

گیسوئے جہدِ عمل اپنے کبھی برہم نہ تھے
شاکیٔ قسمت وہ کوئی اور ہوگا، ہم نہ تھے
ایک گردش میں بدل سکتے تھے نظمِ کائنات
اختیاراتِ غمِ الفت ہمیں کچھ کم نہ تھے
اپنی فطرت پرسکوں تھی صورتِ موجِ نسیم
اپنے جذبے ہم مزاجِ شعلہ و شبنم نہ تھے
حرف آجاتا مذاقِ زندگی کے نام پر
وہ تو یوں کہیے کہ ہم عنوانِ ذکرِ غم نہ تھے
صاف گوئی اپنا شیوہ تھا بہ رنگِ اعتماد
کوئی اپنا اور کسی کے ہم کبھی محرم نہ تھے
عمر بھر ہم احترامِ زخمِ دل کرتے رہے
پیکرِ ضبطِ خلش تھے، خوگرِ مرہم نہ تھے
گریۂ شبنم کی رونق یہ نوازش ہو تو ہو
ورنہ پہلے تو کبھی یوں دامنِ گل نم نہ تھے

رونق دکنی

غزل

رخ حیات پہ اگلی سی تازگی نہ رہی
جو تم گئے تو گلوں پہ شگفتگی نہ رہی

چلے تھے ان کی شکایت انھیں سے کرنے کو
یہ اور بات ہے ان میں وہ بات ہی نہ رہی

اداس اداس ہے میخانہ شام سے یارو
کہ میکشوں میں وہ پہلی سی تشنگی نہ رہی

بصد خلوص اسیروں نے دل جلائے ہیں
کسی بھی گوشے میں زنداں کے تیرگی نہ رہی

صلیب و دار سے آواز دی تو ہے عشرت
مگر وہ عشق میں اگلی سی آگہی نہ رہی

س۔ ا۔ عشرت

شہکار جمیل

حیات وارثی

ہوس و عشق میں اک جنگ رہی ہے برسوں
اہل الفت پہ زمیں تنگ رہی ہے برسوں

تیری نظروں سے ہم آہنگ رہی ہے برسوں
زندگانی مئے گلرنگ رہی ہے برسوں

اک نظر دیکھا تھا فطرت کا وہ شہکار جمیل
چشم نظارہ مگر دنگ رہی ہے برسوں

ضبط غم دیکھ کہ تجھ سے کبھی شکوہ نہ کیا
آرزو گو کہ شفق رنگ رہی ہے برسوں

اے غم دوست تجھے اپنا بنانے کے لئے
غم دوراں [illegible]

غزل

حالِ چمن بہار میں کتنا عجیب ہے
معروفِ آہ و نالہ ہر اک عندلیب ہے

تم سے نہیں ہے اپنی تباہی کا کچھ گلہ
جو کچھ ہے میرے سامنے میرا نصیب ہے

پہلی سی اب نہیں ہیں وہ سینے میں دھڑکنیں!
شاید دلِ حزیں تری منزل قریب ہے

دل میں خیال ترکِ محبت تو ہے مگر
ہر دم مری زبان پہ ذکرِ حبیب ہے

جو دشمنِ سکوں ہے اسی کا ہے جور کش
فطرت ہمارے دل کی بھی کتنی عجیب ہے

دنیا ہے دھوپ چھاؤں کی تصویر دوستو!
کس درجہ روشنی سے سیاہی قریب ہے

عزمیؔ نہیں ہے سہل رہِ منزلِ وفا
اک اک قدم پہ مشکلِ دار و صلیب ہے

صفدر عزمیؔ

غزل

ایک ذرا سی چیز پہ ہم نے سارا جیون وار دیا
خودداری نے زندہ رکھا خودداری نے مار دیا

سوچ کی چٹانوں پر جس غم نے ہم کو مصلوب کیا
اس سے اتنی ہی نفرت کی ہم نے جتنا پیار دیا

جب تک چپ چپ غم سہتے تھے زندگی کی اک صورت تھے
وہ لمحہ غدار تھا جس نے حوصلۂ اظہار دیا

خالی جھولی لے کر اب ہم تیرے آگے کیسا آئیں
جس سے ساری دنیا جیتی ہم نے وہ دل ہار دیا

اس مجبوری کو کیا کہئے جس نے غم کی راہوں میں
سورج سر پہ چڑھ آیا تو عکسِ لب و رخسار دیا

کتنی ہی امیدیں مرنے آئے تھے لیکن مر نہ سکے
خوش فہمی کے شہر میں خود کو دھوکا کتنی بار دیا

سب کے ہونٹوں پر صدیوں کی خاموشی کا روغن تھا
سب نے ہی الفاظ تراشے جملوں کا انبار دیا

ایک بچھا کا ریزہ ریزہ اک انساں بے روح ضمیر
آئینے سے پوچھ رہا ہوں کس نے کس کو مار دیا

کھینچ کے خاموشی کی چادر میرے سر پہ اے پروازؔ
کس نے میرے زخم کریدے کس نے سچا پیار دیا

نصیر پروازؔ

غزل

نہ جانے چیخ بنے درد، یا دعا ہو جائے
پتہ نہیں ترے جانے کے بعد کیا ہو جائے

کھنڈر کھنڈر ہی رہے اب نہ راستہ ہو جائے
دلِ غریب نہ پھر نذرِ حادثہ ہو جائے

ادھورے پن کا ہے احساس اپنے فن میں لئے
وگرنہ آدمی اپنی جگہ خدا ہو جائے

دکھائی دینے لگے صاف پھر ترا چہرہ
ہر ایک زخم اگر دل کا آئینہ ہو جائے

وہ آدمی جو غمِ زندگی کا باغی ہے
اسے شعورِ غمِ زندگی عطا ہو جائے

بجا سہی کہ حقیقت میں ایک فریب ہے تو
وہ کیا کرے کہ جسے اعتبار سا ہو جائے

امید و بیم تو یوں بھی ہے خیرؔ بند صدف
چلو اس آخری در پر بھی اک صدا ہو جائے

رؤف خیرؔ

غزل

غم باعثِ تسکین دل و جان تو نہیں ہے
غم شدتِ احساس کا درماں تو نہیں ہے

ہم سمجھے ہوئے منزلِ مقصود ہیں جس کو
یارب وہ کہیں شامِ غریباں تو نہیں ہے

اتنا تو ذرا اہلِ نظر بھی کبھی دیکھیں
دیوانے کے ہاتھوں میں گریباں تو نہیں ہے

نشتر سے میرا زخمِ جگر چھیلنے والو!
اس دردِ مسلسل کا یہ درماں تو نہیں ہے

طوفاں سے الجھتا ہے کبھی برق و شرر سے
بہکا ہوا اس دور کا انساں تو نہیں ہے

(نامکمل)

لکشمی نارائن فارغؔ (اجمیر)

بھارت چند کھنہ

طنزیہ

ستیہ گرہ لاٹ ود

ستیہ گرہ کے موجد گاندھی جی تھے۔ وہ غالباً دنیا کے واحد انسان تھے جن کو روح کی قوت میں اعتقاد تھا اور جنھوں نے اس کی طاقت کے کرشمے دکھلائے تھے۔ مثلاً جب ان کو زبردست انسانی طاقت اور اس کی ناانصافی کا سامنا کرنا پڑا تو بطور احتجاج انھوں نے ستیہ گرہ کا حربہ استعمال کیا۔ گاندھی جی کے ستیہ گرہ کا بنیادی اصول یہ تھا کہ احتجاج کرنے والا راستی پر ہو اور احتجاج حق بجانب ہو۔ اُن کا طریقۂ کار یہ تھا کہ احتجاج بالکلیہ اپنی مرضی سے کیا جائے اور کسی قسم کا راست یا بالراست تشدد کا استعمال نہ کیا جائے۔ یعنی احتجاج کنندہ کو دکھ درد اور اذیت میں مبتلا کرے اور اس وقت تک مصیبت اور کشٹ میں خود کو مبتلا رکھے جب تک کہ وہ شخص یا ادارہ جس کے کسی عمل کے خلاف احتجاج کیا جا رہا ہو، از خود اور بغیر کسی جبر کے اپنا غیر منصفانہ برتاؤ بدل نہ دے۔ یعنی اپنے تئیں اس قدر متاثر ہو جائے کہ اس کو اپنے رویہ، اپنے خیالات اور اپنے نظریوں پر نظرثانی کرنی پڑے اور اُسے راستی، راستبازی اور سچائی کا راستہ نظر آنے لگے۔ یہ تھا گاندھی جی کا نظریہ ستیہ گرہ جو بالکلیہ عدم تشدد کی بنیادوں پر قائم کیا گیا تھا۔

لیکن جب سے ہندوستان آزاد ہوا ہے اور ہم ہندوستانی آزاد ہو گئے ہیں، ترقی کی منزلیں تیزی سے طے کی جا رہی ہیں۔ مثلاً چیزوں میں ملاوٹ کر کے اُن کی مقدار کو بڑھا دینے میں ہم شاید ہر قوم سے بڑھے ہوئے ہیں۔ رائی جتنی چیز کو پہاڑ جتنا بنا دینے میں ہم کو کامل مہارت حاصل ہے۔ اور اپنے اس عمل کو ہم نے محدود نہیں رکھا۔ بلکہ اغذیہ سے لے کر ادویات تک میں آمیزش کی خود مختاری ہم نے حاصل کی ہے۔ اور آمیزش بھی ایسی لامحدود اور موثر کی جاتی ہے کہ اگر انسان اپنے ملک کی آزاد فضا سے بے بس ہو کر مرنا چاہے تو زہر بھی ایسا ملاوٹ والا ملے کہ اس کو کھا یا پی کر اور اپنی کھاٹ پہ پڑ کر وہ ہزار ایڑیاں رگڑے مگر موت کے گھاٹ نہ اتر سکے۔ اس کے برعکس کوئی سخت جان اگر موت سے بچنے کے لیے کسی ماہر معالج کی تجویز کردہ دوائی خرید کر استعمال کرے تو ملاوٹ کی وجہ سے اس کی بے اثری ایسی موثر ہو کہ بغیر ایڑیاں رگڑے یا دوائی فروش سے جھگڑے اپنے خالق کے حضور میں بلا قصور اور بن بلائے اس تیزی سے پہنچ جائے کہ اُس دوسری دنیا میں اُس کے سواگت کا

انتظام بھی خاطر خواہ طور پر نہ کیا گیا ہو۔

ہمارے ملک کے ماہران ملاوٹ نے گاندھی جی کے ستیہ گرہ کے ساتھ بھی کچھ ویسا ہی سلوک کیا جیسا وہ دیگر اشیا کے ساتھ کرنے کے عادی ہو چکے ہیں یا اولاً انہوں نے یہ بالکل فراموش کر دیا کہ ستیہ گرہ کی وجہ سچائی یا انصاف کی طلب ہونی چاہئے۔ انہوں نے ہر اس معاملہ کے تعلق سے ستیہ گرہ کرنا شروع کر دیا جہاں مقصد اپنا الو سیدھا کرنا تھا۔ ستیہ گرہ کرنے کے جو طریقے اپنائے گئے ان میں گو عدم تشدد مفقود نہیں تھا مگر بالواسطہ طور پر جبر کے عناصر موجود تھے۔ مثلاً "پکٹنگ" آہستہ کام کرنا، فیکٹری کے اندر یا باہر دھرنا دینا، قلم یا اوزار رکھ دینا اور اسٹرائیک کرنا۔ یہ طریقے بغیر کسی تشدد کے کئی سال تک مقبول رہے اور پھر بنگال میں ان ہی طریقوں کو گھیراؤ کا جامہ پہنا کر ایک بالکل ہی نئی اور سودیشی شئے تیار ہوئی۔

بنگال میں گاندھی جی کے نظریے کو دقیانوسی قرار دے کر خیر باد کہہ دیا گیا کہ اس کے تحت احتجاج کرنے والے کو اذیت اور مصیبت اپنے اوپر مسلط کرنی پڑتی تھی۔ اس کے علاوہ گاندھی جی کے فارمولے کے مطابق کی جانے والی کارروائی زود اثر نہیں تھی اور اس میں "ان کو خبر ہونے تک" خاک ہو جانے کا احتمال بھی تھا۔ اس لئے دانشوران بنگال نے گاندھی جی کے ستیہ گرہ کی اذیت اور مصیبت کا بوجھ زیادہ مستحق لوگوں کے کندھوں پر منتقل کر دیا جن سے مانگیں منوانے کا مسئلہ درپیش ہوتا۔ اگر ذرا غور کیا جائے تو جدید ستیہ گرہ کی مقبولیت آسانی سے سمجھ میں آتی ہے۔ یہ کوئی طلسماتی تاری جیسی شئے تو نہیں جو سمجھ سے باہر ہو۔ آخر ہم لوگ اولاد تو اس وحشی انسان ہی کی ہیں جو تاریخ کے قدیم اور سیاہ دور میں برہنہ رہتا تھا، زور بازو سے حق پیدا کرتا تھا۔ اور یہ بھی جانتا تھا کہ کمزور کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں!

الغرض "گھیراؤ" بنگال میں ایجاد ہو کر کیرالا سے ہوتا ہوا سارے ملک میں مقبول ہو گیا۔ اس کے خریدار اور سوداگر تو خیر سودیشی ہیں۔ البتہ اس کا عمل دیسیوں اور بدیسیوں پر نہایت غیر جانبدارانہ طریقہ پر یکسانگی سے کیا جاتا ہے تاکہ ہماری پراچین تہذیب کا جھنڈا اونچا رہے۔ اور کسی کو ناروا داری کے برتاؤ کی شکایت پیدا نہ ہو۔ اس ایک معاملہ کی حد تک بدیسی لفظ کو استعمال کرنے میں کسی کٹر ریاست نے کوئی اعتراض نہیں کیا اور نہ ہی اس کا سرکاری ترجمہ کر کے انہیں زحمت گوارا فرمائی۔ دراصل گھیراؤ کے تصور میں یہ حقیقت نہاں ہے کہ زحمت کوئی دوسرا گوارا فرمائے۔

گھیراؤ کو زیادہ موثر بنانے کے لئے بعض ریاستی حکومتوں نے اس کو قانونی طور پر جائز قرار دیا۔ گو تعزیرات کی رو سے کسی کا گھیراؤ کرنا کسی کو جبراً غیر قانونی طور پر حراست میں لینے کے مترادف ہے اور اس لئے جرم ہے۔ بعض ریاستوں میں یہ بھی جائز اور مناسب سمجھا گیا کہ جب کسی کا گھیراؤ کیا جارہا ہو تو اس کی تکمیل نہایت پرامن طریقہ پر ہونے دینی چاہئے۔ اور پولیس وغیرہ کو اس کا حق نہیں ہونا چاہئے کہ وہ کسی درخواست پر وہ دخل در معقولات کے مرتکب ہوں!

پھر ایک وقت ایسا بھی آیا جب گھیراؤ کرنے والوں پر وہ انتظار کی گھڑیاں بھی جن میں گھیراؤ کئے جانے والے بھوک، پیاس اور دیگر ضروریات سے نڈھال ہو کر تسلیم خم کر کے گھیراؤ کرنے والوں کا غم غلط کرنے پر آمادہ ہو جائیے، وہ بھی غیر ضروری اور قابل احتراز تاخیر سمجھی جانے لگیں۔ اختصار اور تیزی موجودہ زندگی کے اہم اجزا ہیں اور پھر جب بالآخر مانگیں مان ہی لی جاتی ہیں تو پھر فیکٹری یا اداروں کے منتظمین کو بلاوجہ گھیراؤ سے پیدا ہونے والی اذیت پہنچانے سے فائدہ!

چنانچہ موجودہ ستیہ گرہی مالکوں کے پاس ہاتھ میں ڈنڈا لئے

چاتو اور دل میں اپنی مرضی کے مطابق فیصلہ کرانے کی دھن لئے پہونچتے ہیں اور اپنی تیار کردہ دستاویز پر دستخط حاصل کر لیتے ہیں۔ ایسی کارروائیوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ جہاں رعایات، مراعات اور اجرت میں اضافے منظور کرا لئے جاتے ہیں، وہاں کام اور کارکردگی میں کچھ کمی کروائی جاتی ہے تاکہ خسارہ کی نکاسی میں سو فیصدی ترقی ہو سکے! باقی رہا ایسی کارروائیوں کو غیر قانونی سمجھے جانے کا مسئلہ تو اس ضمن میں یہ مت بھولئے کہ قانون ازل سے اندھا رہا ہے۔ اس کی نظر میں کسی دستاویز پر اگر کسی کا جعلی دستخط نہیں تو وہ مستند سمجھا جائے گا۔ خواہ وہ بالجبر ہی کیوں نہ حاصل کیا گیا ہو!!

گھیراؤ کے بانی فرماتے ہیں کہ گھیراؤ ستیہ گرہ ہی کی دوسری شکل ہے۔ گاندھی جی خود پر مصیبت نازل کر لیتے تھے اور انہوں نے اپنے آزاد دیش میں محض اتنی سی تبدیلی پرانے ستیہ گرہ میں کرلی ہے کہ کشٹ میں صرف ان دشمنوں کو ڈالا جاتا ہے جو بلا شک و شبہ اس کے پورے مستحق ہیں اور سچ پوچھئے تو ہمارا دھرم و ایمان بھی تو ہمیں یہی سکھلاتا ہے کہ سب انسان برابر برابر ہیں۔ وہ خدا کا عکس ہیں۔ اس لئے ایک دوسرے میں تفریق نہیں کرنی چاہئے۔ بطور احتجاج خود مرن برت رکھنے کے بجائے اپنے ہی عکس یعنی مالکوں اور منتظمین کو کیوں ایسا برت رکھنے کی سعادت حاصل کرنے سے محروم کیا جائے؟ وہ دراصل مل وغیرہ کے مالکوں کو نیک نامی حاصل کرنے کے مواقع فراہم کرتے ہیں۔ اور اگر اس کشمکش میں منتظمین وغیرہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں تو اور بھی اچھا، کیونکہ کسی دوسرے کی بھلائی کی خاطر جان قربان کرنے پر جنت کے دروازے انکے لئے یقیناً کھل جائینگے۔

شکیل انوار

رشتوں کی سرحد

رات کافی تیز بارش ہوئی تھی۔ اور گندے نالے کے دونوں طرف پڑی جھگیاں بھیگ گئی تھیں۔ بھیگ جانے پر عجیب سی گھٹی گھٹی بدبو نکل رہی تھی اور آس پاس پڑا ہوا کوڑا کرکٹ شہر کے سب سے گندے کوڑا گھر کا منظر پیش کر رہا تھا۔

حوالدار ہری رام نے نفرت سے ناک سکوڑ لی۔ اس کی پیشانی پر سلوٹیں ابھر آئیں اور آنکھوں سے عجیب سی الجھن جھلکنے لگی۔ دل چاہا بھاگ جائے۔ اس طرح کے پھر ادھر کا رخ ہی نہ کرے۔ لیکن آدمی بعض اوقات دل کی غلامی نہیں کرتا۔ اور اکثر مجبوریاں بھی بڑی طاقتور ہوتی ہیں۔ ہری رام نے سوچا اور ایک گہری سرد سانس کھینچ کر اس نے یہاں سے بھاگ جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

سورج نکل آیا تھا۔ مگر ابھی تک یہ بستی سورج کی مسکراہٹ سے محروم تھی۔ چھ چھ منزلہ عمارتوں سے کچھ پیچھے تو اس بستی کے نصیب جاگیں۔ جھونپڑے جیسے ان عمارتوں کے بعد دنیا سے سورج طلوع ہونے کے بعد اپنی مسکراہٹوں کے چند پھول پھینک دیتا تھا۔ اور شب تمام بستی کے لوگ یوں کھل اٹھتے جیسے خشک زمین میں مرجھاتے پودوں کو پانی مل جاتا ہے۔ اور اب جب کہ برسات کی نم ہواؤں نے جھگیوں میں [illegible] کی سی پیدا کر دی تھی۔ سورج کی مسکراتی کرنوں کے پھول اور بھی قیمتی ہو گئے تھے۔

آج بھی سورج کی مسکراتی کرنوں کے چند پھول ہی اس بستی کے نصیب میں آئے تھے۔ لیکن حوالدار ہری رام نے جیسے ہی بستی میں قدم رکھا تھا کچھ یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے ہر پودہ پھر سے مرجھانے لگا ہے۔ جھگیوں سے باہر نکلے لوگوں کے اداس اور پریشان چہرے یوں معلوم ہو رہے تھے جیسے تمام دن رکشا کھینچاتی رہا ہو جیسے دھلائی کے باوجود ڈاٹا تمک پینے کو پیسہ بچے ہوں یا دن بھر کوٹھہ کا میک اپ بنا کر گڑگڑا لینے اور بھیک مانگنے کے باوجود دو روپے بھی نہ مل سکے ہوں۔ جھگیوں کے اندر جاگے ہوئے لوگوں نے ایک دوسرے کی طرف یوں خوف سے دیکھا تھا جیسے رات بھوکے ہی سو گئے ہوں۔ میونسپلٹی کے نل پر پانی بھرنے والے جوان چہروں پر پریشانی کے بادل کچھ یوں گھر آئے جیسے جسم کے وہ حصے عریاں ہو گئے ہوں جن کو چھپانا ضروری ہوتا ہے۔

حوالدار ہری رام بستی کے وسط میں آچکا تھا اور نظر آنے والے ہر مرد، عورت کو کچھ یوں محسوس ہوتا جیسے کسی مجرم کی تلاش ہو۔ لوگوں نے نگاہ کے پھول برسائے اور وہ چہل قدمی کے انداز میں چلتا ہوا ایک جھگی کے سامنے جا کر رک گیا۔ جھگی کے دروازے پر بھیگا ہوا ایک ٹاٹ کا پردہ پڑا تھا۔ "جگو سنگھ یہیں رہتا ہے؟" ہری رام نے سخت لہجے میں وہاں کھڑے ایک کمزور سے آدمی سے کلام کیا۔ جیسے کسی ملزم کو بید مار رہا ہو۔ "ہاں حضور اسی میں رہتا ہے" اس آدمی نے ساڑی کا پردہ پڑی جھگی کی طرف اشارہ کر دیا۔

ہری رام نے اپنے ہاتھ میں دبے بید سے پردہ ہٹایا اور گردن ڈال کر اندر جھانکا اور ٹھٹھک کر کھڑا رہ گیا۔ بمشکل آٹھ دس مربع فٹ جگہ ہوگی۔ ایک کونے میں گندے گودڑے اور پرانے ڈبے رکھے تھے اور انہیں کی بغل میں جگو ایک بچہ اور ایک نوجوان لڑکی بے خبر سوئے ہوئے تھے۔ ہری رام نے تھوک نگل لیا۔ وہ کئی بار جگو کے پاس آیا گیا تھا۔ لیکن یہ لڑکی؟ کمبخت جگو۔ سالا نہ جانے کس ڈبے میں چھپائے ہوئے تھا۔ ہری رام نے دل ہی دل میں جگو سنگھ کی ماں کا رشتہ اپنے آپ سے جوڑ ڈالا اور پھر لڑکی کو گھورنے لگا۔

لڑکی کے جسم پر کپڑوں کے نام پر چند چیتھڑے تھے۔ اور ان چیتھڑوں کے درمیان سے نہ جانے کتنی ہی جگہ جسم جھانک رہا تھا۔ ہری رام خوش تھا کہ اس نے اس لڑکی کو اس وقت دیکھا تھا جب وہ بے خبر سو رہی تھی۔ وہ دیکھتا رہا اور کچھ یوں دیکھتا رہا جیسے اس منظر کو اپنی آنکھوں میں قید کر لینا چاہتا ہو۔ وہ لڑکی بے خبر چت لیٹی تھی۔ اور جوبن جیسے بغاوت کر بیٹھا تھا اور سینے پر برائے نام ایک تنگ چولی کسی تھی۔ ہری رام نے پھر سے تھوک نگل لیا۔ سینے سے نیچے پیٹ ننگا تھا۔ اور اس کے نیچے ہی پیوند لگی ساڑی کے کنارے ڈھیلے ہونے کے باوجود جسم کے خدوخال یوں نمایاں کر رہے تھے کہ ہری رام اس کا "ایکسرے" دیکھ رہا تھا۔ "حرامی کہیں کا ہی سیکڑوں بار یہاں آیا مگر جانے سالے نے کہاں چھپائے رکھا" اسے جگو سنگھ پر شدت سے غصہ آنے لگا اور پھر وہ ٹھٹک گیا۔

لڑکی کو چہرے پر کچھ رینگتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اس طرح جیسے کہیں بجلی کا کرنٹ چھو گیا ہو۔ اس نے تیزی سے پلو سنبھالا۔ "ابے او جگو، سالے سنتا ہی نہیں" ہری رام نے موقع کی نزاکت سمجھتے ہوئے وہیں کھڑے کھڑے آواز لگائی۔ یہ اس کی پرانی تجربہ کاری تھی۔ جگو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ پھر آنکھیں پھاڑے ہری رام کی طرف دیکھنے لگا۔ بڑی مشکل سے آواز نکل پائی۔

"حکم حضور"۔

"ابے اٹھ کر باہر آ۔ میرا منہ کیا دیکھ رہا ہے۔ حوالدار ہری رام نے کسی بوڑھے کچھوے کی طرح گردن باہر کھینچ لی۔ اور جگو اس کے پیچھے ہی باہر نکل آیا۔ ہری رام نے اپنی پنڈلی پر ہاتھ میں پکڑا ہوا بید ٹھونک دیا۔ کسی بہت ہی سنجیدہ مسئلہ پر وہ اسی طرح غور کیا کرتا تھا۔ وہ جب نہیں بولا تو جگو نے اپنے میلے کرتے کی جیب سے دو بیڑیاں نکال کر سلگائیں۔ ایک اپنے منہ میں لگا کر دوسری ہری رام کی طرف بڑھا دی۔ ہری رام نے اس کے ہاتھ سے بیڑی لے کر خاموشی کے ساتھ کش لینا شروع کر دئے۔ پنڈلی پر بید اب بھی بج رہا تھا۔ قریب ہی کھڑے جگو کا دل کسی طرح کے اندیشوں میں ڈوبا جا رہا تھا۔ پیٹی والے اور پھر ہری رام جیسے پڑھے لکھے پولیس والے بہت خطرناک ہوتے ہیں۔ جگو جو دھندہ کرتا تھا اس میں زندگی بھر کا پولیس والوں سے واسطہ تھا۔ اور یہ بھی جانتا تھا کہ یہ خاکی وردی پہننے والے آدمی کی ہر نس میں جرم گھول دیتے ہیں اور پھر کھال ادھیڑ لیتے ہیں۔

ہری رام نے بید والا ہاتھ روک لیا اور بولا "یار جگو موسم بڑا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ چل ایک ایک چائے ہو جائے"

جگو اس کا چہرہ دیکھتا رہ گیا۔ ہری رام کا لہجہ اس کے لئے اجنبی نہیں تھا۔ لیکن آج اس کے لئے یہ نرم لہجہ غیر معمولی طور پر اجنبی ہو کر رہ گیا تھا۔

"چلو چلو یار" ہری رام نے جگو کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ جگو کچھ کہہ ہی نہ سکا۔ جیسے اس کی قوت گویائی سلب ہو گئی ہو۔ بس وہ کچھ سمجھے بغیر اس کے ساتھ چل پڑا۔

جگیوں کی گھنونی بستی جب گذر گئی اور وہ دونوں سڑک کے کنارے خوانچے کی طرح رکھی ہوئی ایک چھوٹی سی چائے کی دوکان پر آگئے تو ہری رام نے جگو کے گلے میں پڑا ہوا ہاتھ ہٹالیا۔ اور دوکاندار کو گھور کر دو چائے کا آرڈر دیا۔ پھر وہ جگو سے بولا۔

" میں صبح ہی صبح تیرے پاس اس لئے آیا تھا کہ میرا تبادلہ ہو گیا ہے"

" تبادلہ ہو گیا ہے۔ جگو نے ذرا پریشان ہو کر معلوم کیا " اب ؟"

" اسٹیشن روڈ سے کٹ گھر چوکی پر۔ تو اب چاہے تو وہاں اپنا دھندا پھیلالے۔ کام دوگنا ہو جائے گا۔"

جگو جیسے ہاتھوں میں آئی خوشی کو تھام نہیں پا رہا تھا۔ حوالدار ہری رام کو بڑا زوردار علاقہ مل گیا تھا۔ کٹ گھر میں دن بھر لوگوں کی بے پناہ بھیڑ ہوتی ہے۔ جگو لوگوں کی بھاری جیبیں ہلکی کیا کرتا تھا۔ اس کے اس دھندے کے لئے کبھی نہ ختم ہونے والی بھیڑ کی ضرورت ہوتی ہے۔

" حوالدار ساب۔ یہ تو بڑی کھوسی کی بات ہے۔ جلدی سے اپنا کمیشن بولو۔"

دوکاندار کا لڑکا چائے لے آیا تھا۔ دونوں نے چائے سے بھرے ہوئے گلاس لے لئے۔

" کمیشن کی کیا بات کرتا ہے رے " ہری رام نے اپنے لہجے میں ضرورت سے زیادہ مٹھاس گھولتے ہوئے کہا۔ " تو کیا میرے لئے کوئی غیر ہے"

جگو نے پھر چونک کر حوالدار ہری رام کے چہرے پر اپنی نگاہیں مرکوز کر دیں۔ جیسے اسے پہچان رہا ہو۔

" اچھا تب شام کو کہاں مل رہا ہے۔ ہری رام نے چائے کا خالی گلاس تپائی کے نیچے رکھتے ہوئے کہا۔

" کیوں ساب" ؟

" میرا دل چاہتا ہے آج تجھے تاڑی پلاؤں۔۔۔" ہری رام نے سر پر رکھی ہوئی ٹوپی اتاری اور سر کھجاتے ہوئے بولا۔ " تو نے مجھے بہت پلائی ہے۔ چل آج میں پلاؤں۔"

جگو نے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن درمیان ہی میں ہری رام جلدی سے بول پڑا۔ " بول کہاں ملے گا ؟"

" تم جہاں حکم دو۔ حوالدار۔"

" اچھا تو پھر اپنی جھگی پر ہی ملنا۔ میں آؤنگا۔ بس میں چلتا ہوں"

ہری رام نے سڑک پر جاتے ہوئے ایک خالی رکشا کو روک لیا۔

" اچھا ساب " جگو ، ہری رام کا طرف ایک عدد سلام اچھالتا ہوا بستی کی طرف چل دیا۔ ہری رام کی رکشا بھی چل پڑی تھی۔

رکشا چل رہی تھی اور وہ بیٹھا سوچ رہا تھا۔ چلو ایک الجھن سے تو نجات ملی۔ ایک عرصہ سے دارونہ جی نے ناک میں دم کر رکھا تھا۔ کتنی ہی بار اس نے کہا تھا۔ حوالدار ہری رام تم کیا نہیں کر سکتے۔ سب کچھ تمہارے ہاتھوں میں ہے۔ عورت سے شراب تک۔ ہمارے جیسے افسر تو بس تمہارے نام پر جیتے ہیں۔ کچھ انتظام کرو نا۔ اور ہری رام ہر بار ہنس کر تسلی دے گیا تھا۔

" ہو سکا ساب۔۔۔۔ سب کچھ ہو سکا۔ آپ کا حکم بجالانے ہی کو تو ہم لوگ پیدا ہوئے ہیں۔ بہت دن گزر گئے تھے۔ لیکن ہری رام دارونہ کے لئے شراب کے سوا اور کوئی انتظام نہیں کر سکا تھا۔

مگر آج اس کے دل کا تمام بار ہلکا ہو گیا تھا۔ وہ لڑکی جگو کی جھگی سے نکل کر حوالدار ہری رام کے خیالوں میں لہرا گئی۔

" دارونہ جی تم بھی کیا یاد کروگے" ہری رام نے دل ہی دل میں بڑبڑایا۔ اور جب تھانے پہونچے تو دارونہ جی نہیں تھے۔ دوپہر تک اس نے کسی طرح وقت گزارا۔ وہ جلد سے جلد دارونہ جی کو اپنی کارگزاری بتا دینا چاہتا تھا۔ شام کو دارونہ جی واپس آگئے۔ تو وہ ایک کونے میں لیجا کر بولا۔

" صاحب آج انتظام ہو جائے گا۔

" اچھا ! دارونہ کا چہرہ چمک گیا۔ تم بہت قابل ہو ہری رام تم ضرور ترقی کروگے۔۔۔ اسٹار پا جاؤگے۔۔۔"

" یہ تو آپ کی مہربانی ہے صاحب۔ اسٹار مل گئے تو۔"

" تم بے فکر رہو۔ میں تمہاری سفارش کر دونگا۔"

" عمر بھر احسان نہیں بھولوں گا۔ حوالدار ہری رام نے ایڑیاں بجائیں اور سلوٹ مار کر باہر نکل آیا۔

اور سیدھا جھگیوں والی بستی کی طرف چل پڑا۔ بستی میں پھر وہی قیامت کا سماں پیدا ہو گیا۔ اور جب حوالدار ہری رام جگو کے گلے میں ہاتھ ڈال کر بستی سے باہر نکل گیا تب پھر زندگی لوٹ آئی۔

راستے میں ہری رام نے جگو سے کہا۔ "تجھ پہ داروغہ بہت خوش ہے بے۔"

"غریب پرور آفیسر ہیں ساب۔" جگو نے دانت نکال دیئے اور خواہ مخواہ ہنسنے لگا۔

گڑھی کا چوراہا پار کرتے ہی تاڑی خانہ آگیا۔ اور وہ دونوں اندر گھس گئے۔

جب کچھ دیر بعد دو دو گلاس تاڑی ان کے معدوں میں اتر گئی تب تیسرا گلاس مانگتے مانگتے ہری رام نے پھر سے جگو کے گلے میں ہاتھ ڈال دیا۔

"جگو یار، تیرے کتنے بچے ہیں..."

"دو۔" جگو نے سر کو ٹیبل پر جھکاتے اور پھر اوپر اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔

"مگر یار تو نے کبھی انہیں دکھایا نہیں۔ مجھے غیر سمجھتا ہے۔ اوں۔"

"اے کیا کہتے ہو ساب۔" جگو کا لہجہ لڑکھڑا گیا تھا۔ "توبہ ہے میری" اس نے اپنے دونوں کان پکڑ لیے۔ "میں بھلا آپ کو غیر سمجھوں۔ صبح دونوں جھگی ہی میں تو پڑے تھے۔"

"میں نے غور نہیں کیا۔ اچھا چل اب گھر چلیں۔"

دونوں ڈگمگاتے قدموں سے تاڑی خانہ سے اٹھ کر باہر سڑک پر آگئے۔ اور بستی کی طرف چل پڑے۔

"یار جگو۔ ایسا کر۔ تو آج رات کو اپنے بچوں کو لے کر میرے کوارٹر پر آجا۔ آئے گا نا۔؟"

جگو کا دل چاہا کہہ دے۔ بڑی عجیب سی ضد کرتے ہو حوالدار۔ اگر بچے دیکھنے ہیں تو ابھی چل کر دیکھ لو۔ مگر تاڑی نے اس کے ذہن کی رفتار کو سست کر دیا تھا۔ اس نے بڑا مختصر سا جواب دیا۔

"جیسی آپ کی مرضی سرکار۔"

"اچھا تو میں باہر والی سڑک سے تھانے چلا جاؤں گا۔ تو اپنے بچوں کو لے کر میرے کوارٹر پر آجا۔ یار کیا بتاؤں جب سے یہاں آیا ہوں بچوں کی یاد بہت آتی ہے۔ ہر بچے کو پیار کرنے کو دل چاہتا ہے۔ تو اپنے بچوں کو ضرور لانا۔"

"ضرور، ضرور" جگو ڈگمگاتا ہوا بستی کی طرف بڑھنے لگا۔

"میں بس ابھی آجاتا ہوں۔ حوالدار بس ابھی.......

تمہیں اپنے بچوں کی یاد آتی ہے نا... میرے بچے بھی تمہارے ہی ہیں۔ تم ان کو پیار کرنا۔" جگو بڑبڑاتا ہوا بستی میں داخل ہو گیا۔

حوالدار ہری رام نے چلنے کے لیے تیزی سے قدم اٹھایا تھا۔ مگر ایسا ایسا محسوس ہوا کہ وہ یہاں سے ایک قدم بھی نہ چل سکیگا۔ جگو کی آواز نے اسے باندھ لیا تھا۔ اور اس کے کانوں میں ابھی تک وہی آواز گونج رہی تھی۔ یقین اور اپنائیت سے بھرپور۔ بناوٹ اور مکاری سے پرے، بالکل سیدھی سچی بات۔

"میرے بچے بھی تمہارے ہی ہیں حوالدار... میرے بچے..."

ہری رام نے تھانے جانے کا ارادہ بدل دیا۔ اور وہیں کھڑے جگو کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔

تھوڑی ہی دیر بعد جب جگو اپنے لڑکے اور جوان لڑکی کو ساتھ لے آیا تو ہری رام وہیں کھڑا تھا۔

"کیا بات۔ حوالدار صاب... تم یہیں کھڑے ہو۔"

"ہاں" ہری رام نے بھاری آواز میں جواب دیا۔ پھر اس نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہی صبح والے چیتھڑے اور وہی معصومیت۔

"یہ میری لڑکی ہے حوالدار ساب" جگو بولا۔ "اور یہ میرا لڑکا" لڑکی شرمائی، شرمائی، گردن جھکائے کھڑی تھی۔ ہری رام اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

اگر وہ صاف ستھری ساڑی پہن لے۔ تو اس میں اور میری نیرا میں کیا فرق رہ جائے گا۔ ہری رام نے سوچا۔ اور ہر خیال کہ جگو کی لڑکی اس کی اپنی نیرا کا روپ بدلتی گئی۔ اسے محسوس ہوا جیسے

تیرا ہی کھڑی ہو۔ ہری رام کا دل بھر آیا۔

اور پھر بے اختیار اس نے جگو کی لڑکی کے سر پر شفقت سے بھرپور ہاتھ رکھ دیا۔

"خوش رہو بیٹی۔ ..." پھر جلدی سے بولا۔

"اچھا جگو اب میں چلتا ہوں۔ میں نے تیرے بچے دیکھ لئے۔ بھگوان ان کو ہر بلا سے بچائے۔ یہ سدا خوش رہیں۔" ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ہری رام اپنے آنسو روکنے کی کوشش کر رہا ہے۔ "اچھا اب میں چلو" دیئے ہوا الداد ساب، ان کو اپنے کوارٹر پر نہیں لے جاتے۔"

ہری رام کو اپنا سارا جسم لرزتا سا محسوس ہوا جیسے خود اسکو کسی نے چوری کرتے پکڑ لیا ہو۔ وہ اس احساس کی چبھن کو برداشت نہ کر سکا۔ "نہیں جگو نہیں"۔ ہری رام کی آواز بھر آگئی "انہیں دیکھ لیا بس"۔ اور ہری رام لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا تھانے والی سڑک پر چل پڑا۔ جگو نے جاتے ہوئے ہری رام کی طرف تعجب سے دیکھا اور جب وہ اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تو اس نے دونوں بچوں کو ساتھ لئے اپنی جھگی کی طرف چل پڑا۔۔

ضیاء حسنی

تیری بدخوئی نے ظالم کردیا بدخو ہمیں

الطاف حسین خاں اپنی بیگم سے خفا ہو کر گاؤں آ گئے تھے۔ ان کی موجودگی میں الطاف منزل میں بہار آگئی تھی۔ پورے بنگلے میں سپیدی کی گئی، رہائشی کمروں کو نیلے رنگ سے رنگوا دیا گیا تھا، بنگلے سے ملا ہوا باغ جو مدتوں سے ویران پڑا تھا مالک کے آتے ہی کھل اٹھا۔ صبح اور شام گاؤں کی دلکش موسیقی کے سہارے بجتے ہوئے فلمی نغموں سے گونج اٹھتی تھی۔ نہر کے کنارے چلتے ہوئے گاؤں کے باسی رس بھرے نغموں کو سن کر ٹھہر جاتے۔ ان میں سے کچھ من چلے خود بھی گنگنانے لگتے۔ شوخ لڑکیاں گاگر لئے کنویں پر پہنچ جاتیں چہلیں کرتی رہتیں۔ اور جب تک ریڈیو آن رہتا پانی کے بہانے وہیں ٹکی رہتیں۔ ایک دن بتیس اتنی محو ہو گئی کہ اس کے ہاتھوں سے رسی چھوٹ گئی گھڑا کنویں میں چلا گیا۔ اس کی محویت نے تماشہ بنا دیا۔ شوخ اور شریر لڑکیوں نے اُسے خوب ہی ستایا۔

زمیندار کا یہ مضافاتی بنگلہ سلیمان پور کے کچے مکانوں کے بیچ ایسا دکھائی دیتا جیسے ریگستان میں کوئی نخلستان ہنس رہا ہو اور یہی دل کشی ہر اجنبی کو در پہ سے کھینچ لیتی۔ ایک دن

[illegible]

chair) میں بیٹھے ہوئے گپیں لڑا رہے تھے۔ ذرا فاصلے پر ان کا نوکر شبراتی بیٹھا ہوا تھا۔ ایک مرد اور ایک عورت اس کے پاس آکر رک گئے۔ شبراتی نے اشارے سے کہا کہ وہ مالک سے ملیں۔ جیسے ہی وہ دونوں خاں صاحب کے قریب پہنچے تو انھوں نے شبراتی سے پوچھا۔

"یہ کون ہیں دونوں؟"

"کام ڈھونڈنے آئے ہیں سرکار"۔

خاں صاحب نے عورت کو نگاہ بھر کے دیکھا تو وہ شرم سے دوہری ہو گئی۔ اس کی بڑی بڑی نشیلی آنکھیں اور مکھن ایسی رنگت انہیں بھا گئی۔ وہ اُسے لگاتار دیکھتے رہے اور تھوڑی دیر کے بعد بولے "انھیں روک لو کوئی نہ کوئی کام نکل آئے گا"۔ وہ کچھ نہ کہہ سکے لیکن ان کی گردنیں احسان مندی کے بوجھ سے دب گئیں۔

دوسرے دن دونوں کو بیس روپے ماہوار پر نوکری مل گئی۔ خاں صاحب نے شبراتی کو بلا کر حکم دیا کہ وہ اپنا سامان کچے مکان سے بنگلے میں لے آئے۔ وہ اکیلا ہے یہاں کہیں بھی رہ سکتا ہے وہ مکان خادم کے قریب ہے۔ جمن وہیں رہے گا مزدوروں کے [illegible] بنگلے کی صفائی اور وہ سب کام کرے گی

جمن کاہل تھا۔ اس لئے اسے اپنا کام پسند آیا۔ بیٹھے بیٹھے حقہ پیا رہتا۔ اور مزدوروں پر نگاہ بھی رکھتا تھا۔ بھوک نے جمن کو نڈھال کر دیا تھا۔ اب دو وقت کھانا ملنے لگا تو چہرے کا رنگ بدل گیا۔ جوان اور امنگوں سے بھرپور رکمی کو بنگلے کے رہن سہن نے اپنے ماحول کے مطابق ڈھالنا شروع کیا۔ اور وہ جلد ہی خان صاحب کے قریب پہونچ گئی۔ اب اسے کھانے کو اچھی غذائیں ملتیں اور پہننے کو صاف کپڑے۔ اس کا روپ رنگ نکھر آیا۔ اور مانگ انگ سے شوخی ابلنے لگی۔ اور ایک دن جب اسے خان صاحب کے مخملی گدے پر بیٹھنے کا موقع ملا تو وہ سامنے رکھے ہوئے آئینے کو لگاتار دیکھتی رہی۔

"آئینے کو دیکھے جا رہی ہے پگلی! مجھ سے پوچھ کتنی سندر ہے تو"

"مالک! میں آپ کے پیر کی جوتی ہوں، آپ کی سیوا کرنا میرا کام ہے اور دل بہلانا بھی"۔

"ایسا نہ سوچ! اب تو نوکرانی نہیں رہی، میرے دل کی رانی بن چکی ہے"

رکمی نے شرما کر سر جھکا لیا۔ خان صاحب کی دست درازیوں نے اسے دھیرے دھیرے اور بے باک بنا دیا اب وہ گاؤں کی سیدھی سادی عورت نہیں رہی تھی، اسے دل جیتنے کے بہت سے گر آ گئے تھے، خان صاحب کے یہاں سے وہ کافی روپے جھٹک لاتی اور جمن کو دیتی رہتی۔ اسے شراب اور دو وقت کے کھانے کے علاوہ کسی چیز کی ضرورت نہ تھی۔ وہ اسی لت کی وجہ سے کبھی چوری کرتا تھا۔ اور اب رکمی کی کمائی نڈر ہو کر کھانے لگا تو نشہ بازی کی سوجھی۔ گاؤں سے ذرا فاصلہ پر شراب کی دوکان تھی، وہیں وہ چلا جاتا اور شراب پی کر گھنٹوں مست پڑا رہتا۔ ایک دن اس کا پرانا یار وہیں مل گیا۔ اسے اچھی حالت میں دیکھ کر وہ ہنسا۔ اسے رکمی کا سارا حال معلوم ہو گیا تھا۔ پیر بخش پیشہ ور بھکاری تھا۔ ایک دن وہ جھولی لٹکائے اطاف منزل پہونچا تھا: "سرکار کے بال بچے سلامت رہیں" کی صدا جیسے ہی اس نے لگائی تو رکمی بھیک دینے پہونچی، جانے پہچانے فقیر کو دیکھا تو اس کی آنکھوں میں چمک اور گالوں پر سرخی دوڑ گئی۔ فقیر سے نہ

رہ گیا۔ اس نے برجستہ کہا۔

"سالے دلدر دھل گئے یہاں، خدا قسم کیا رنگ روپ نکلا ہے"۔

"جا حرام جادے (حرام زادے)" بھکاری بھکاری کو ٹھینگے مٹکاتے ہوئے وہ چپاک سے اندر چلی گئی۔

پیر بخش نے شراب کا تلخ گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے کہا۔

"اب کیا تیرے مجے ہی مجے (مزے ہی مزے) ہیں۔ نعمتیں کھا اور موج کر، پر سنا جمیندار (زمیندار) بجر (نظر) کا کھراب (خراب) ہے"۔

"کھان صاحب (خان صاحب) بڑا دیالو ہے۔ ہم دونوں کا کافی خیال رکھتا ہے۔"

"تیری گھر والی ہے بھی ایسی کہ اس کی طرف من خود بخود کھنچنے لگتا ہے۔ جرا (ذرا) اس پر کڑی نگاہ رکھنا"۔

"ارے! کیا بکتا ہے؟"

یہ کہتا ہوا جمن گھر چلا آیا۔

دوسرے دن کافی رات بیتنے تک رکمی نہیں آئی تو جمن کو پیر بخش کی یاد آئی اور وہ خود بخود کہنے لگا۔

"پیر بخش سچ کہتا ہے۔ گھر والی ہاتھ سے جا رہی ہے۔

رکمی آئی تو اس نے خلاف معمول بھدی سی گالی دی اور کہنے لگا۔

سچ سچ بتا تو اتنی رات تک کیا کرتی رہتی ہے"

"نوکری ہے پرائی تابعداری"

"کھان صاحب (خان صاحب) اکیلے کتنا کام پھیلائے رکھتے ہیں کہ تجھے آدھی رات تک چھٹی نہیں دیتے۔

"بڑے آدمیوں کے یہاں کاموں کی کمی نہیں ہوتی"۔

اگلے دن جمن آدھی رات تک انتظار کرتا رہا۔ آخر وہ سو گیا۔ صبح ہوتے ہوئے وہ آئی تو اس نے اسے مارا بھی اور گالیاں دیتے ہوئے کہا

"اب کھان صاحب (خان صاحب) کے یہاں گئی تو ٹانگ توڑ دوں گا"

"نہ جاؤں گی لیکن مکان چھوڑنا پڑے گا اور یہ گاؤں بھی"۔

"اس جنگی (زندگی) سے بھوکوں مرنا اچھا ہے۔"

تاروں کی چھاؤں میں دونوں گاؤں سے چل دیئے۔ اور دن نکلتے نکلتے اپنے گاؤں پہونچ گئے۔ رکھی نے جمن سے کہا۔

"کوئی کام ڈھونڈھ لو، یہ معمولی رقم کب تک چلے گی؟"

"کاہے کو مری جاتی ہے، کوئی نہ کوئی کام مل جائے گا۔"

لیکن جمن کی فطری کاہلی تو اسے پستی میں ڈھکیلنا چاہتی تھی۔ اس لئے وہ کوئی کام نہ کرسکا اور تھوڑے دنوں میں وہ خالی ہاتھ ہوگیا۔ ایک دن رکھی کے ساتھ جنگل سے لکڑی چن کر آرہا تھا تو کھیا کے دروازے پر خاں صاحب کا نوکر شبراتی بیٹھا ہوا دکھائی دیا۔ شبراتی نے جمن کو قریب بلاکر دھیرے سے کہا۔

"سرکار تم سے کافی خفا ہیں، تھانے میں رپٹ کرنے جارہے تھے، میں نے انہیں روک دیا اور کہا کہ آج ہی میں دونوں کو سمجھا کر واپس لے آؤں گا۔"

"نہیں ہم دونوں ابھی چلتے ہیں۔ یہاں اب میں دکھ جھیل سکوں گا۔ جیل کاٹنے کی ہمت نہیں۔"

جمن شبراتی کی دھونس میں آکر کہنے لگا۔

"میں نہ جاؤں گی۔ رکھی بولی۔

"چل بھی"

"نہیں"۔

"کیسے کام چلے گا کسی طرح پیٹ بھرنا ہے۔ تجھے میری قسم! سپاہی کی بات نہ ٹال۔"

"اور چارہ بھی تو نہیں ملی یہاں" رکھی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

بعد دونوں شبراتی کے ساتھ سلیمان پور کی طرف اس طرح خوشی خوشی چل دیئے جیسے پردیس سے اپنے گھر جارہے ہوں۔ کھیتوں کی میڑوں پر چلے جارہے تھے تینوں، آگے آگے شبراتی چل رہا تھا اور پیچھے پیچھے میاں بیوی،

اب راتوں میں جمن شراب کے نشے میں مست لیٹا رہتا، ایسے میں شوخ اور چنچل رکھی خوشبو میں بسی ہوئی واپس آتی تو خفا ہونے کی بجائے وہ کہتا۔

"کتنی اچھی لگ رہی ہے۔"

"آج بہت پی گئے ہو۔"

"ذرا یہاں تو آ۔"

"مجھے اب سونے دو، مجھ سے دوہری سیوا نہ ہوگی۔"

"ھِین، ہی ہی" کر کے ہنسنے لگتا۔

تھوڑے دنوں کے بعد خان صاحب کو گاؤں کے ماحول نے اکتا دیا۔ اب انہیں شہر کی دلچسپیاں یاد آنے لگیں۔ رکھی بھولنے والی چیز نہ تھی لیکن خان صاحب ورائٹی (VARIETY) کے قائل تھے، ماحول کی یکسانیت انہیں پسند نہ تھی، وہ منہ کا ذائقہ بدلتے رہنے کے عادی تھے۔ شہر جاتے ہوئے انہوں نے گاؤں کا انتظام رکھی کے سپرد کرکے اسے اور پابند بنا لیا۔ اب وہ الطاف منزل کی کیر ٹیکر بھی تھی اور کھیتی کے کاموں میں بھی لگی رہتی۔ خان صاحب کا پرانا نوکر شبراتی اس کا مددگار تھا اور راز دار بھی۔ دوسری جنگ عظیم شروع ہوچکی تھی، خان صاحب عہدوں کے پیچھے دوڑتے نہ تھے بلکہ عہدے خود ان کا پیچھا کرتے تھے۔ ضلع کی سطح پر کوئی عزت تھی جو انہیں ملی نہ تھی۔ اب کی وہ شہر آئے تو انہیں حکومت نے ریکروٹنگ آفیسر بنا دیا۔ انہوں نے ان گنت نوجوانوں کو محاذ پر بھیج کر لقمۂ اجل بنوا دیا اور اس خدمت کے صلہ میں حکومت برطانیہ نے انہیں خان بہادر کے خطاب سے نوازا۔ اسی زمانہ میں ڈلیسی ان کے بے چین دل میں دھیرے سے اتر آئی۔ خان صاحب اسے وارفتگی کی حد تک چاہنے لگے۔ ڈلیسی نے انہیں اپنی طرف تیزی سے بڑھتے ہوئے دیکھا تو ذرا بے نیاز ہوگئی۔ ان کی بے چینی بڑھتی رہی آخر خان صاحب کے آہنی عزم کے آگے ڈلیسی کی بے نیازی نے دم توڑ دیا۔ خان صاحب نے دولت، کار اور پرفضا بنگلے کی ڈور ڈلیسی کی طرف اس طرح بڑھائی کہ وہ اس میں الجھی ہوئی دھیرے سے ان کی طرف چلی آئی۔ ڈلیسی نے آہستہ آہستہ خاں صاحب کو بدلنا شروع کیا۔ اب وہ بیڈ ٹی پینے لگے اور شیروانی چوڑیدار پاجامے کو چھوڑ کر سوٹ میں ملبوس دکھائی

دینے لگے۔ مصاحبوں کا دخل بھی کم ہوگیا۔ کچھ دنوں تک خان صاحب ڈلیسی کی پرستاری کرتے رہے۔ اس لئے وہ ان کی ضرورت بھی تھی۔ دعوتوں اور ضیافتوں میں نہ تو ان کی پردہ دار بیگم ساتھ دے سکتی تھیں اور نہ ہی رکھی کا وہاں لے جانا کسی طرح مناسب تھا۔ ڈلیسی ان کے یہاں آنے والوں کو کافی اچھا شو (SHOW) دیتی۔ اس طرح انہیں انٹرٹین کرتی کہ ان کے دل کی کلی کِھل جاتی۔ غرض کہ ڈلیسی نے یہ خلا پُر کر دیا۔ وہ ڈنر، پارٹیز اور ایٹ ہوم کے موقعوں پر شمعِ محفل بن جاتی۔ پروانے اس کے گرد منڈلاتے اور خان صاحب کے انتخاب کی داد دیتے۔

خان صاحب ڈلیسی سے جلد ہی اکتا گئے کہ وہ اپنی کیٹ کی پابند تھی اور ان کی آزاد طبیعت ان تمام پابندیوں کی عادی نہ تھی۔ ڈلیسی پان کھانے کو برا سمجھتی اور ان کا منھ اُگالدان بنا رہتا۔ جب خان صاحب کھانے کی میز پر بیٹھتے تو اس وقت ذراسی بے قاعدگی بھی ڈلیسی کو کھل جاتی اور اسی وقت ٹوک دیتی۔ کبھی کبھی خان صاحب کا موڈ آف ہو جاتا تو وہ اپنی ساری رنگینیوں اور رعنائیوں کو سمیٹ کر ہونٹوں پہ لے آتی اور پیار بھرے انداز میں مخاطب ہوتی۔ وہ اسی لمحہ جیسے سب کچھ بھول جاتے۔ اس لئے کہ انہیں اس کا انداز دلبری بے حد پسند تھا۔ اسی دوران میں سیٹھ کیلاش کی خان صاحب کے یہاں کافی نشست رہنے لگی۔ ڈلیسی ان سے بے نیاز ہو کر نوجوان کیلاش کی طرف متوجہ ہوگئی۔ خان صاحب نے اسی میں اپنی عافیت سمجھی اور انہیں ایسا لگا کہ جیسے گلا گھونٹنے والے ریشمی پھندے کی گرہیں کھل رہی ہوں۔ اور وہ دانستہ طور پر دونوں کو ملنے کا موقع دیتے رہے۔ ایک دن اچانک کیلاش ڈلیسی کو لے کر سوری چلا گیا۔ خان صاحب ڈلیسی کی طرف رجوع ہوتے ہوئے بھی رکھی کی وفاؤں کو بھولے نہ تھے اس لئے کہ جیسی خدمت اس نے کی تھی ویسی ڈلیسی کے بس کی بات نہ تھی۔ ڈلیسی کی موجودگی میں رکھی کبھی گاؤں سے آجاتی تو خان صاحب اس سے وضعداری کے طور پر ہنس کر باتیں کرتے تو وہ ڈانٹ دیتی۔

"عجیب ٹیسٹ ہے آپ کا، گندی دیہاتی عورتوں کو اتنا لفٹ دے رکھا ہے، پھر یہ تو آپ کی نوکرانی ہے۔"

"کافی خدمت گزار ہے! تم نہیں جانتیں۔"

"تو سر پر بٹھا لیجئے!"

غرض کہ خان صاحب نے ڈلیسی سے چھٹکارا حاصل کر لیا تو سیدھے سلطان پور پہونچے۔ رکھی اسی طرح ان کی دل داری کرتی رہی۔ اب وہ دوسری نو عمر لڑکیوں کو بھی خان صاحب سے ملوایا کرتی۔

ایک دن خان صاحب ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ رکھی مسکراتے ہوئے آئی اور کہنے لگی۔

"کیا سوچ رہے ہیں سرکار"۔

"سکھیا جتنا مایوس کرتی جا رہی ہے اتنا ہی اسے حاصل کرنے کا شوق بڑھتا جا رہا ہے۔"

"میں اسے راستہ پر لاؤں گی سرکار!"

"کب؟"

"کل دن ڈھلتے ہی وہ حاضر ہو جائے گی۔"

"میں تجھے خوش کر دوں گا رکھی!"

"آپ سدا خوش رہیں، یہی میری خوشی ہے مالک۔"

"سرکار برا نہ مانیں تو ایک بات پوچھوں؟"

"ضرور"

"میم صاحب سے تو اچھی نہیں ہے سکھیا!" رکھی کو شرارت سوجھی۔

"تصنع مجھے پسند نہیں کہ تم لوگ میرے ٹیسٹ پر پوری اترتی ہو۔"

دوسرے دن سکھیا الطاف منزل سے نکل آم اور جامن کے درختوں کے پاس آئی تو اس کی آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں اور ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ رکھی نے اسے اس حالت میں دیکھا تو ہنستے ہوئے پوچھا۔

"پگلی! رو تی کیوں ہے؟ تجھے تو خاصی دیر لگ گئی۔"

"حرام جادی! مجھے بہکا کر یہاں لے آئی اور مجھے تباہ

کر کے اب ہنستی ہے۔"

"نہ جانے کیوں تو اتنا سوچ رہی ہے۔ ناکجو! جوانی بھر نہ آئے گی۔ اور یہ روپ رنگ باقی نہ رہے گا۔ اس وقت یہ دھنی تیری طرف نگاہ بھر کبھی نہ اٹھائیں گے"

سکھیا رکمی کو گالیاں دیتی ہوئی اور روتی ہوئی گھر چلی گئی۔

کئی مہینے بیت گئے، خان صاحب کو گاؤں کی فضا ایسی بھائی کہ وہ شہر کی رنگینیوں اور دلچسپیوں کے متعلق کبھی سوچتے بھی نہ تھے، کبھی پندرہ بیس دن اتوار کو چند گھنٹوں کے لئے شہر جاتے اور کوئی انگریزی پکچر دیکھ کر گاؤں واپس آجاتے۔ چلتے وقت بیگم سے کہتے،

"محض تمہیں دیکھنے آجاتا ہوں، ورنہ کھیتی کے کاموں سے فرصت ہی نہیں ملتی۔ کئی بیگھوں کا ایک اور آم کا باغ لگوا رہا ہوں اسی کی دیکھ بھال میں لگا رہتا ہوں۔"

یہ سن کر بیگم مطمئن ہو جاتیں۔

برسات کی ایک ٹھنڈی ٹھنڈی پرسکون رات تھی۔ گھنگھور گھٹائیں گھر گھر کر آرہی تھیں، رم جھم پانی برس رہا تھا۔ خان صاحب برآمدے میں کرسی پر بیٹھے ہوئے گاؤں کے پرفضا ماحول سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ گیس کی روشنی سے برآمدہ بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ سامنے دو عورتیں چھاتا لگائے ان کی طرف چلی آرہی تھیں۔ جب وہ قریب پہونچیں تو خان صاحب پہچان گئے۔

"سکھیا کیسے آئی؟ اچھی تو ہے"

"آج یہ خوشی خوشی آئی ہے سرکار"

رکمی نے ہنستے ہوئے کہا۔

لیکن سکھیا کچھ نہ بولی البتہ اسکی خاموشی صاف کہہ رہی تھی۔

"تیری بدخوئی نے ظالم کر دیا بدخو ہمیں۔"

Registered with the Registrar of News Paper Registered No. 8285/64

REGD No.
H. 985

MARCH
1971

POONAM URDU MONTHLY

Office-cum-Residence :
Phone : 5 2 9 5 7

Editor : NASIR KURNOOLI

AZAMPURA.
HYDERABAD-24

Statement about ownership and other particulars about

POONAM URDU MONTHLY

FORM IV

1.	Place of its publication·	Hyderabad. (A. P.)
2.	Periodicity of its publicati n.	Monthly
3	Printer's Name.	Nasir Kurnooli
	(whether citizen of India)	Indian
	Address.	16-7-300/1 Azampura, Hyderabad-24
4.	Publisher's Name.	Nasir Kurnooli
	(whether citizen of India)	Indian
	Adress.	16-7-300/1 Azampura, Hyderabad-24
5.	Editor's Name.	Nasir Kurnooli
	(whether citizen of India)	Indian
	Address.	16-7-300/1 Azampura, Hyderabad-24.
6.	Names and addresses of individuals who own the Newspaper or shareholders holding more than one percent of the total capital.	Nasir Kurnooli 16-7-300/1 Azampura, Hyderabad-24

I, NASIR KURNOOLI, hereby declare that the particulars given above are true to the best of my knowledge and belief.

Dated 1-3-1971.

Nasir Kurnooli.

Signature of Publisher





ادبی ٹرسٹ
حیدرآباد کے
چوتھے
کل ہند مشاعرے
کے
موقع پر
مخدوم محی الدین
اور
سلیمان اریب
کی کمی
شدت سے
محسوس کی گئی -

ماہنامہ

Price 75 P.

حیدرآباد

پونم

ماہنامہ

حیدرآباد

مدیر:۔ ناصر کرنولی

جلد:۔ ۸

شمارہ:۔ ۲

قیمت ۷۵ پیسے

زر سالانہ ۱۰ روپے

ششماہی ۶ روپے

دفتر اور ترسیل کا پتہ:۔

مینجر ماہنامہ پونم ۱/۳۰۰-۷-۱۶

اعظم پورہ۔ حیدرآباد۔۲۴

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلیشر

ناصر کرنولی۔ ایم۔اے، عثمانیہ

مطبوعہ:۔ دائرہ الکٹرک پریس چھتہ بازار

ترتیب

ثریا محمود ندرت

شاعر مشرق

اردو کو بین الاقوامی شہرت دینے والوں میں اقبال کا نام سرِ فہرست آتا ہے۔ وہ اپنے دور کے زبردست فلسفی اور بلند پایہ شاعر تھے۔ ان کی شاعری کی ابتدا انیسویں صدی کے اواخر سے ہوئی۔ مشورۂ سخن داغ دہلوی سے کیا داغ کی جوہر شناس نگاہ نے اس بیش قیمت ہیرے کو پرکھ لیا۔ لہٰذا انھوں نے تھوڑے ہی عرصہ بعد کہہ دیا۔ "کلام میں اصلاح کی گنجائش بہت کم ہے"۔ علامہ نے اپنی شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے کی تھی لیکن زیادہ دنوں تک وہ رسمی و روایتی غزل گوئی کے دامن سے وابستہ نہ رہ سکے اور بہت جلد ان کا رجحان نظم کی طرف ہو گیا۔ ان کی شاعری کے تین ادوار ہیں۔ پہلا دور وطن پرستی اور اتحاد باہمی کے مضمون سے پُر نظر آتا ہے۔ دوسرے دور کے کلام میں اہلِ مغرب کی تہذیب و تمدن سے بیزاری کا اظہار اور تیسرے دور کا کلام اسلام کی عظمت و وقار کی داستانوں سے لبریز ہے۔ اقبال تقریباً پندرہ سال تک اردو میں کہتے رہے۔ لندن کے دوران قیام میں ہی انھوں نے محسوس کیا کہ اسلامی ممالک تک اپنی آواز پہنچانے کا بہترین ذریعہ اردو سے زیادہ فارسی ہے۔ لہٰذا ان کی توجہ فارسی کی طرف منعطف ہو گئی یہ سلسلہ ان کی مشہور مثنوی "اسرار خودی" سے شروع ہوا جس میں انھوں نے فلسفۂ خودی کو نہایت ضبط و نظم کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یہی وہ کتاب ہے جس کی اشاعت نے علامہ کو مشرق و مغرب کے علمی حلقوں سے روشناس کیا

ہمالہ، نیا شوالہ، ترانۂ ہندی، ان نظموں میں ان کی وطن پرستی کا جذبہ بالکل واضح نظر آتا ہے۔ ان کی شاعرانہ زندگی میں "ہمالہ" کو ایک خاص مقام اس لئے حاصل ہے کہ یہی ان کی پہلی نظم ہے جس نے اقبال کو شعر و ادب کی دنیا سے متعارف کرایا۔ اس نظم میں ہندوستان کی عظمت و شکوہ کا ذکر بڑے پُر زور انداز میں ملتا ہے۔

اے ہمالہ، اے فصیل کشور ہندوستان
چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسمان
تجھ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشان
تو جواں ہے گردشِ شام و سحر کے درمیاں
ایک جلوہ تھا کلیم طور سینا کے لئے
تو تجلی ہے سراپا چشم بینا کے لئے

امتحانِ دیدۂ ظاہر میں کوہستاں ہے تو
پاسباں اپنا ہے تو دیوارِ ہندوستاں ہے تو
مطلعِ اول فلک جس کا ہے وہ دیواں ہے تو
سوئے خلوت گاہِ دل دامن کشِ انساں ہے تو
برف نے باندھی ہے دستارِ فضیلت تیرے سر
خندہ زن ہے جو کلاہِ مہرِ عالم تاب پر

نیا شوالہ" میں باہمی اتحاد اور ملت و محبت کا پیغام دیتے ہوئے کہتے ہیں ۔

آ، غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں
بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقشِ دوئی مٹا دیں
سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی
آ، اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں
دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ
داماںِ آسماں سے اس کا کلس ملا دیں
ہر صبح اٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے
سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں
شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

"ترانۂ ہندی" ہندستان کا مقبول ترین ترانہ ہے ۔ اس میں حب الوطنی کے جذبات اپنے نقطۂ عروج پر ہیں ۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی، یہ گلستاں ہمارا
غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں
سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا
پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا
وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا
گودی میں کھیلتی ہیں اس کی ہزاروں ندیاں
گلشن ہے جن کے دم سے رشکِ جناں ہمارا

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا
[illegible]
[illegible] رہا ہے دشمن دور [illegible]

آخر کے دو شعر خصوصیت کے ساتھ توجہ کے قابل ہیں۔ پہلے شعر [illegible] وطن کی محبت، عظمت اور قومیت کا عالم نظر آتا ہے اور دوسرے شعر میں ہزاروں برس قبل کے ہندوستان کے نقوش نظر آتے ہیں۔ جب ہندوستان میں علوم و تہذیب کی شمع روشن ہوئی، دنیا کے دوسرے ممالک میں انقلابات آئے، سلطنتیں مٹیں اور [illegible] ختم ہو گئیں لیکن ہندوستان کی زندگی کا تسلسل ایک حقیقت کی طرح اٹل رہا۔

۱۹۰۵ء میں اقبال نے یورپ کا سفر کیا۔ وہاں ان کا قیام تین سال تک رہا۔ اس دوران میں انہوں نے [illegible] سے مغربی فلسفہ اور وہاں کی تہذیب و تمدن کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا جس کے نتیجہ میں سماجی زندگی کی کشمکش، ملک گیری کی حریصانہ یلغار، خود غرضانہ سیاست کی نیرنگیوں اور ظاہری آب و تاب کی حقیقت عیاں ہو گئی۔ وہ ان مشاہدات سے کافی متاثر ہوئے، یہ وہ زمانہ تھا جب پہلی جنگِ عظیم کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ مغربی تہذیب انسانیت کی دشمن نظر آ رہی تھی۔ ان کی نگاہوں میں انسانی زندگی کی کوئی قدر و قیمت نہیں تھی۔ ان کا دل اخلاقی و روحانی قدروں کی پامالی پر تڑپ اٹھا اور یہی احساس ان کے فکری انقلاب کا باعث بنا [illegible] دور شروع ہوا۔ ۱۹۰۷ء میں [illegible] نظم

"زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدارِ یار ہوگا"

شائع ہوئی۔ یہ نظم اقبال کے ذہنی تغیر کی آئینہ دار ہے۔

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
جسے کھرا تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا

ثریا محمود ندرت

شاعرِ مشرق

اردو کو بین الاقوامی شہرت دینے والوں میں اقبالؔ کا نام سرِفہرست آتا ہے۔ وہ اپنے دور کے زبردست فلسفی اور بلند پایہ شاعر تھے۔ ان کی شاعری کی ابتدا انیسویں صدی کے اواخر سے ہوئی۔ مشورۂ سخن داغؔ دہلوی سے کیا داغ کی جوہر شناس نگاہ نے اس بیش قیمت ہیرے کو پرکھ لیا۔ لہٰذا انھوں نے تھوڑے ہی عرصہ بعد کہہ دیا۔ "کلام میں اصلاح کی گنجائش بہت کم ہے"۔ علامہ نے اپنی شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے کی تھی لیکن زیادہ دنوں تک وہ رسمی و روایتی غزل گوئی کے دامن سے وابستہ نہ رہ سکے اور بہت جلد ان کا رجحان نظم کی طرف ہو گیا۔ ان کی شاعری کے تین ادوار ہیں۔ پہلا دور وطن پرستی اور اتحاد باہمی کے نغموں سے پُر نظر آتا ہے۔ دوسرے دور کے کلام میں اہلِ مغرب کی تہذیب و تمدن سے بیزاری کا اظہار اور تیسرے دور کا کلام اسلام کی عظمت و وقار کی داستانوں سے لبریز ہے۔ اقبالؔ تقریباً پندرہ سال تک اردو میں کہتے رہے۔ لندن کے دوران قیام میں ہی انھوں نے محسوس کیا کہ اسلامی ممالک تک اپنی آواز پہنچانے کا بہترین ذریعہ اردو سے زیادہ فارسی ہے۔ لہٰذا ان کی توجہ فارسی کی طرف منعطف ہو گئی یہ سلسلہ ان کی مشہور مثنوی "اسرارِ خودی" سے شروع ہوا جس میں انھوں نے فلسفۂ خودی کو نہایت ضبط و نظم کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یہی وہ کتاب ہے جس کی اشاعت نے علامہ کو مشرق و مغرب کے علمی حلقوں سے روشناس کیا

ہمالہ، نیا شوالہ، ترانۂ ہندی، ان نظموں میں ان کی وطن پرستی کا جذبہ بالکل واضح نظر آتا ہے۔ ان کی شاعرانہ زندگی میں "ہمالہ" کو ایک خاص مقام اس لئے حاصل ہے کہ یہی ان کی پہلی نظم ہے جس نے اقبالؔ کو شعر و ادب کی دنیا سے متعارف کرایا۔ اس نظم میں ہندوستان کی عظمت و شکوہ کا ذکر بڑے پُر زور انداز میں ملتا ہے۔

اے ہمالہ، اے فصیلِ کشورِ ہندوستان
چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسمان
تجھ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشان
تو جواں ہے گردشِ شام و سحر کے درمیاں
ایک جلوہ تھا کلیمِ طورِ سینا کے لئے
تو تجلی ہے سراپا چشمِ بینا کے لئے

امتحانِ دیدۂ ظاہر میں کوہستاں ہے تو
پاسباں اپنا ہے تو دیوارِ ہندوستاں ہے تو
مطلعِ اول فلک جس کا ہے وہ دیواں ہے تو
سوئے خلوت گاہِ دل دامن کشِ انساں ہے تو
برف نے باندھی ہے دستارِ فضیلت تیرے سر
خندہ زن ہے جو کلاہِ مہرِ عالمتاب پر

"نیا شوالہ" میں باہمی اتحاد اور ملت و محبت کا پیغام دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

آ، غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں
بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقشِ دوئی مٹا دیں
سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی
آ، اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں
دنیا کی تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ
دامانِ آسماں سے اس کا کلس ملا دیں
ہر صبح اٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے
سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں
شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

"ترانۂ ہندی" ہندوستان کا مقبول ترین ترانہ ہے۔ اس میں حب الوطنی کے جذبات اپنے نقطۂ عروج پر ہیں۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی، یہ گلستاں ہمارا
غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں
سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا
پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا
وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا
گودی میں کھیلتی ہیں جس کی ہزاروں ندیاں
گلشن ہے جن کے دم سے رشکِ جناں ہمارا

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا
[illegible]
صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا

آخر کے دو شعر خصوصیت کے ساتھ توجہ کے قابل ہیں۔ پہلے شعر میں وطن کی محبت، عظمت اور قومیت کا احساس نظر آتا ہے اور دوسرے شعر میں ہزاروں برس قبل کے ہندوستان کے نقوش نظر آتے ہیں۔ جب ہندوستان میں علم و تہذیب کی شمع روشن ہوئی دنیا کے دوسرے ممالک میں انقلابات آئے۔ سلطنتیں مٹیں اور تہذیبیں ختم ہو گئیں لیکن ہندوستان کی زندگی کا تسلسل ایک حقیقت کی طرح اٹل رہا۔

۱۹۰۵ء میں اقبال نے یورپ کا سفر کیا۔ وہاں ان کا قیام تین سال تک رہا۔ اس دور میں انہوں نے بڑے انہماک سے مغربی فلسفہ اور وہاں کی تہذیب و تمدن کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا جس کے نتیجہ میں سماجی زندگی کی کشمکش، ملک گیری کی حریصانہ بازیگری، خود غرضانہ سیاست کی نیرنگیوں اور ظاہری آب و تاب کی حقیقت عیاں ہو گئی۔ وہ ان مشاہدات سے کافی متاثر ہوئے، یہ وہ زمانہ تھا جب پہلی جنگِ عظیم کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ مغربی تہذیب انسانیت کی دشمن نظر آ رہی تھی۔ ان کی نگاہوں میں انسانی زندگی کی کوئی قدر و قیمت نہیں تھی۔ ان کا دل اخلاقی و روحانی قدروں کی پامالی پر تڑپ اٹھا اور یہی احساس ان کے فکری انقلاب کا باعث بنا اور [illegible] دور شروع ہوا۔ ۱۹۰۷ء میں [illegible] نظم "زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدارِ یار ہوگا" شائع ہوئی۔ یہ نظم اقبال کے ذہنی تغیر کا آئینہ دار ہے۔

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

یہی وہ وقت تھا جب علامہ اقبال کی نگاہ باریک بین نے دیکھ لیا کہ انسانی حیات وارتقا کا مستقبل یورپ کے فلسفۂ زندگی میں نہیں بلکہ حجازی نظم وآئین کے دامن میں پنہاں ہے جسے پیغمبر اسلام نے نوع انسان کے سامنے قدرت کے آخری پیام کے طور پر پیش کیا۔

ملاحظہ ہوں ذیل کے دو اشعار

سنا دیا گوش منتظر کو حجاز کی خاموشی نے آخر
جو عہد صحرائیوں سے باندھا گیا تھا پھر استوار ہوگا
نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سرزمیں کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

لندن کے دوران قیام ہی میں اقبال کا ذہن ارض یثرب کی طرف عزم سفر کا اعلان کرچکا تھا۔ آستانۂ یثرب مرکز فکر ونگاہ تھا۔ لہٰذا مغربی ایوان کی رعنائیاں اور وطن پرستی کا جذبۂ والہانہ دونوں ہی ماند پڑگئے تھے اور اسلام کی باقی رہنے والی عظمت زندہ حقیقت بن کر روشن ہوگئی تھی۔ چنانچہ وہ سرزمین یثرب کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

وہ زمیں ہے تو مگر اے خوابگاہ مصطفیٰ
دید ہے کعبہ کو تیری حج اکبر سے سوا
خاتم ہستی میں تو تاباں ہے مانند نگیں
اپنی عظمت کی ولادت گاہ تھی تیری زمیں
تجھ میں راحت اس شہنشاہ معظم کو ملی
جس کے دامن میں اماں اقوام عالم کو ملی
آہ! یثرب دیس ہے مسلم کا تو ماویٰ ہے تو

"عبدالقادر کے نام" میں وہ اپنا پیام کھلے لفظوں میں اسطرح پیش کرتے ہیں۔

جلوۂ یوسف گم گشتہ دکھا کر ان کو
تپش آمادہ تر از خون زلیخا کردیں
رخت جاں بتکدۂ چیں سے اٹھا لیں اپنا
سب کو محو رخ سعدیٰ و سلیمیٰ کر دیں
دیکھ یثرب میں ہوا ناقۂ لیلیٰ بیکار
قیس کو آرزوئے نو سے شناسا کر دیں
شمع کی طرح جئیں بزم گہ عالم میں
خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں

"شمع وشاعر" میں مغربی طلسم ٹوٹنے اور اسلام کے عروج کی بشارت اس طرح دیتے ہیں۔

دیکھ لوگے سطوت رفتار دریا کا مآل
موج مضطر ہی اسے زنجیر پا ہوجائیگی
پھر دلوں کو یاد آجائیگا پیغام سجود
پھر جبیں خاک حرم سے آشنا ہوجائیگی

نظم "خضر راہ" اسی دور کی تخلیق ہے، جب پہلی جنگ عظیم کے شعلے بھڑک رہے تھے، یہ نظم انہوں نے انجمن حمایت اسلام کے (۳۷) ویں سالانہ اجلاس میں پڑھی تھی۔ عالم یہ تھا کہ پڑھتے جاتے اور روتے جاتے تھے۔ اس وقت مسلمانوں کی حالت دگرگوں ہورہی تھی۔ بیشتر اسلامی ممالک پر انگریزوں کا تسلط تھا۔ ترک لڑائی میں ہار چکے تھے، ان کا خلیفہ دشمنوں کے ہاتھ قید ہوچکا تھا۔ اور فاتحین نے ملک کو آپس میں تقسیم کرڈالا تھا۔ ایران الگ دم توڑ رہا تھا اور عرب، ترکوں سے آزادی حاصل کرنے کیلئے دشمنوں سے مل گئے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ترکوں سے بچ کر فرانس اور برطانیہ کے پنجۂ ظلم میں گرفتار ہوگئے۔ اور بیت المقدس پر صلیبی پرچم لہرانے لگا۔

مراقش اور طرابلس پر پہلے ہی انگریزوں اور فرانسیسیوں کا قبضہ ہوچکا تھا۔ اقتدار مسلمانوں کے ہاتھوں سے چھن گیا تھا۔

وہ محکوم اور انگریز حاکم بن گئے تھے۔ اپنی قوم کے اس یاس انگیز حشر کو دیکھ کر اقبال کا دل تڑپ اٹھا۔ اس نظم کا ایک ایک شعر ان کے دلی جذبات کا آئینہ دار ہے۔

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیل
خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز
ہو گئی رسوا زمانے میں کلاہِ لالہ رنگ
جو سراپا ناز تھے ہیں آج مجبورِ نیاز
حکمتِ مغرب سے ملت کی یہ کیفیت ہوئی
ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو کر دیتا ہے گاز

وہ مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے جھنجوڑ کر بیدار کرتے ہیں اور حرم کی پاسبانی کے لئے ملتِ اسلامیہ کو متحد ہو جانے کا درس دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

مومیائی کی گدائی ہے تو بہتر ہے شکست
مورِ بے پر! حاجتے پیشِ سلیمانے مبر
ربط و ضبطِ ملتِ بیضا ہے مشرق کی نجات
ایشیا والے ہیں اس نکتے سے اب تک بے خبر
پھر سیاست چھوڑ کر داخل حصارِ دیں میں ہو
ملک و دولت ہے فقط حفظِ حرم کا اک ثمر
ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لیکر تابہ خاکِ کاشغر

اقبال کو یقین تھا کہ انسانیت مٹ نہیں سکتی۔ اور اسلام فنا نہیں ہو سکتا کیونکہ اسلام ایک زندہ جاوید حقیقت ہے۔ چنانچہ اقبال مسلمانوں کو آنے والے عروج کی خبر اسطرح دیتے ہیں۔

عالمِ حریت کا جو دیکھا تھا خواب اسلام نے
اے مسلماں آج تو اس خواب کی تعبیر دیکھ
کھول کر آنکھیں مرے آئینۂ گفتار میں
آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ

مسلم استی سینہ را از آرزو آباد دار
ہر زماں پیشِ نظر لا یخلف المیعاد دار

اقبال مادیت کے مقابلہ ...... میں روحانیت کے علمبردار تھے لیکن ان کی روحانیت ترکِ دنیا اور گوشہ نشینی کی پیامی نہیں تھی بلکہ روحانیت سے ان کی مراد اپنے وجود و جوہر کا عرفان اور طاقت کو فروغ دینا تھا۔ اقبال کے یہاں سچی "خدا پرستی" "خودی" سے پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندہ سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اقبال کی شاعری میں متعدد "الفاظ" اصطلاح اور علامت کے طور پر استعمال ہوئے ہیں، مثلاً خودی، شاہین، مومن، حجازیت، جو ان کی شاعری کو معنویت وسعت اور فکری عمق دیتے ہیں لیکن بعض معترضین اور ناقدین صرف ان الفاظ کے عمومی اور ظاہری معانی کو بنیاد بنا کر اقبال پر نکتہ چینی کرتے ہیں۔ نیز انہیں فاسشٹی قرار دیتے ہیں۔ یہاں مکمل بحث کی گنجائش نہیں بلکہ لفظ شاہین کے متعلق کچھ عرض کرنا ہے، کہا جاتا ہے کہ اقبال نے مسلمانوں کے سامنے شاہین کی مثال پیش کر کے ان کو کمزوروں پر جھپٹنے اور ان کو اپنی خوراک بنانے کی تلقین کی ہے حالانکہ بات یہ نہیں ہے کسی فرد کو اس کی حوصلہ مندی اور شجاعت کی بنا پر شیر کہا جائے تو اس سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا کہ اس میں درندگی بھی ہے۔ اسیطرح شاہین جیسی صفات پیدا کرنے کا مقصد کمزوروں پر جھپٹنا اور ملی رگڑنا نہیں ہے، بلکہ اپنے اندر خودداری و بلند پروازی جیسی خصوصیات کو جنم دینا ہے۔ اقبال کی درویشانہ فطرت کو شاہین کی یہ خصوصیت بھی پسند ہے کہ وہ آشیانہ نہیں بناتا اور پہاڑوں کی چٹانوں میں بسیرا کرتا ہے۔

اقبال کو صرف ایک فرقہ کا شاعر کہنا بھی تنگ نظری کی دلیل ہے جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ معترض کی نظر محض الفاظ پر ہے،

اس کی روح کی خبر نہیں یا وہ دانستہ اس سے اغماض برتتا جاتا ہے۔ وہ انسان اور انسانیت کے شاعر تھے اور ان کی نظر میں مومن وہی تھا جو انسانیت کی اعلیٰ قدروں کا حامل ہو۔ وہ شاعر جو "مخلوق خدا" کو "اقوام" کے خانوں میں بٹنا گوارا نہ ہو، یہ کیسے پسند کرسکتا ہے کہ نوع انسان فرقوں میں تقسیم ہو۔ ان کی نگاہ بلند تھی اور دل وسیع، وہ تمام انسانوں کو بغیر کسی امتیاز کے ایک رشتہ میں مربوط و منسلک دیکھنا چاہتے تھے،

یہ صحیح ہے کہ اقبال مسلمان تھے اور اس میں بھی شک نہیں کہ ان کے دل میں مسلمانوں کی زبوں حالی و پستی کا درد تھا لیکن وہ ایک سچے اور پکے ہندستانی اور عالی ظرف محب وطن بھی تھے، ذیل کا شعر ملاحظہ ہو۔

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

"رام" کے زیر عنوان اقبال نے جو نظم لکھی ہے اور اس میں ہندستان نیز ہندوؤں کی اس بزرگ شخصیت کو جس انداز میں خراج عقیدت پیش کیا ہے، اس میں اقبال کی وسیع النظری روشن خیالی، بلند ظرفی اور ہندستان پرستی کے عناصر پورے طور پر جلوہ گر ہیں۔ ان کے پیغام کی ہمہ گیری اور آفاقیت کا اعتراف ہندستان کے متعدد ہندو اکابرین نے بھی کیا ہے۔

اقبال کا اصل محاذ ہندستان کے سفید فام آقاؤں اور ان کی لائی ہوئی تہذیب کے خلاف تھا۔ جسے وہ ایشیا کے لئے موت کا پیغام تصور کرتے تھے۔ انہوں نے مغربی ساحروں پر نہایت بھرپور ضرب لگائی ہے اور ہر موقع پر ان کے چہرہ کو بے نقاب کیا ہے

اقبال نے لندن اور یورپ کے دوسرے مقامات کے قیام کے دوران مغربی تمدن اور اہل مغرب کی ڈپلومیسی کا گہرا جائزہ لیا اور اس نتیجہ پر پہونچے کہ مغربی تہذیب کی چمک دمک نمائشی ملمع کاری ہے۔ مغرب میں صرف تن کا اجالا ہے اور من تاریکیوں میں ڈوبا ہوا ہے۔ اہل فرنگ روح کی شمعیں بجھا کر عقل کی روشنی میں بھٹک رہے ہیں اور ان کی معاشرتی زندگی کی جڑیں روز بروز کھوکھلی ہوتی جا رہی ہیں۔

اقبال کی سخنوری کے عروج کا دور ہندستان کا وہ دور تھا جب انگریزوں سے تنفر کے دوش بدوش ان کی تہذیبی اور معاشرتی اقدار کو زندگی کے ہر شعبہ میں سمو لینے کی شعوری و لاشعوری کوشش ہندستانیوں میں نمایاں تھی، لہٰذا انہوں نے اس پہلو پر زیادہ سے زیادہ توجہ صرف کی۔ جو ضروری اور لازمی بھی تھی۔

ان کی دنیا حوصلہ اور امید کی دنیا ہے۔ مایوسی اور ناامیدی ان کے مسلک میں کفر ہے۔ اور بے عملی سے انہیں نفرت ہے۔

بظاہر ان کا خطاب مسلمانوں سے ہے لیکن دراصل ان کی شاعری کی مخاطب پوری نوع انسان ہے اور ان کی شاعری حقیقی معنوں میں

"شاعری جزویست از پیغمبری"

کی آئینہ دار ہے۔

رشید الدین

مولوی غلام ربّانی صاحب

اردو کے ایک خاموش خدمت گذار

بیسویں صدی کے اس ترقی یافتہ دور میں بھی، جب کہ نام و نمود اور شہرت و عزت کے حصول کی خواہش انسانوں میں بہت، زیادہ بڑھ گئی ہے اور ادب و فنونِ لطیفہ کے ذریعہ ہر معمولی آدمی اپنے آپ کو مقبول و مشہور فنکار ثابت کرنے پر تُلا ہوا ہے، بعض ایسے لوگ موجود ہیں، جو نام و نمود سے کوسوں دور ہیں اور خاموشی سے اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔

آج میں اردو کے ایک ایسے ہی خاموش خدمت گذار کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو اردو زبان و ادب میں غلام ربانی کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ اور حیدرآباد میں فروکش ہیں۔ یہ وہی ربّانی صاحب ہیں جنھوں نے جانشینِ داغ حضرت بیخود دہلوی مرحوم کے ساتھ برسوں گذارے ہیں۔ مولانا محمد علی جوہر کے ساتھ کام کیا ہے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب کے پچیس سال تک رفیق رہے ہیں اور غلام یزدانی صاحب جیسے عالم اور ماہر آثار قدیمہ کے ساتھ بھی جنھیں کم و بیش پچیس سال گذارنے کا اتفاق ہوا ہے۔ یہ وہی ربّانی صاحب ہیں جنھوں نے اب تک پانچ ڈکشنریوں کی تیاری میں ہاتھ بٹایا ہے اور اب بھی ایک ڈکشنری کا کام جاری ہے۔ یہ وہی ربّانی صاحب ہیں جن کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور مختلف رسائل میں پچھلے پچاس ساٹھ سال کے عرصہ میں جن کے بے شمار مضامین مختلف موضوعات پر شائع ہو چکے ہیں۔ یہ وہی ربّانی صاحب ہیں جن کے ریڈیو ڈراموں، فیچرز اور نشری تقاریر کی تعداد کوئی دو سو سے بھی زیادہ ہے۔

لیکن اس کے باوجود انھیں آج ہندوستان اور پاکستان میں تو کجا خود شہر حیدرآباد میں بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ اس کی وجہ محض یہی ہے کہ ان کی طبیعت میں انکساری اور خودداری اس درجہ کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے، کہ یہ کبھی کسی کے سامنے اپنے کچھ ہونے کا دعوی نہیں کرتے اور کبھی یہ نہیں چاہتے کہ کسی اخبار یا رسالہ کے ذریعہ ان کے نام کی تشہیر ہو جائے۔ ورنہ اردو زبان میں ان کی خدمات ایسی ہیں کہ ان کی جگہ اگر کوئی اور ہوتا تو آج علامۂ دہر بن کر بیٹھ جاتا اور عبدالحق صاحب اور غلام یزدانی صاحب کے ساتھ گذارے ہوئے پچاس برسوں کی پوری پوری قیمت

وصول کی۔ لیکن اس کے برخلاف ان کا یہ عالم ہے کہ جب میں نے ان سے ان کے بارے میں کچھ لکھنے کیلئے کہا تو وہ صاف ٹال گئے اور یہ ٹالتے رہے لیکن جب میرا اصرار جاری رہا تو بدقت تمام ایک روز وقت نکال کر انہوں نے میرے سوالوں کا جواب دیا اور اس طرح یہ مضمون (جو اسوقت آپ پڑھ رہے ہیں) مکمل ہو پایا۔

ویسے ربانی صاحب کو زیادہ لوگ نہیں جانتے لیکن جو جانتے ہیں وہ انہیں خوب جانتے ہیں، اور ان کی صلاحیتوں سے خوب واقف ہیں۔ میرے اور ان کے خاندانی مراسم ہیں اور بہت قدیم ہیں۔ جب وہ اورنگ آباد کالج میں اردو پڑھاتے تھے تو میرے ماموں مولوی عبدالعزیز صاحب ان کے شاگرد تھے۔ بعد میں ربانی صاحب محکمۂ آثار قدیمہ میں آئے تو یہ دونوں ہم دفتر بھی ہو گئے۔ اسطرح یہ مراسم اور زیادہ گہرے ہو گئے۔ اسی لئے مجھے انہیں بہت قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے اور بار بار میرے دل میں یہ خیال آیا کہ اگر میں نے ربانی صاحب پر کچھ نہ لکھا تو یہ ایک اہم فرض سے روگردانی ہوگی۔ چنانچہ مجھے مسرت ہے کہ آج میں "پونم" کے ذریعہ اپنے اس فرض سے سبکدوش ہو رہا ہوں۔

مولوی غلام ربانی صاحب دلّی سے جانب شمال تیس میل دور واقع ایک قصبہ پلول (جس کا ضلع گڑگاؤں ہے اور جو ان دنوں ہریانہ میں شامل ہے) میں ۱۸۸۸ء میں ایک متوسط زمیندار گھرانہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اسی قصبہ میں حاصل کرنے کے بعد وہ دلی آئے اور گورنمنٹ ہائی اسکول سے انہوں نے میٹرک کامیاب کیا۔ اور مشن کالج دلی میں آنرز میں شریک ہو گئے۔ یہ وہی کالج ہے جہاں ڈپٹی نذیر احمد صاحب کے نبائر محمد رشید فرحت اللہ بیگ اور غلام یزدانی صاحب نے تعلیم حاصل کی ہے۔ لیکن بعض وجوہ کی بنا پر ربانی صاحب اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔ اور دلی کے اکاونٹنٹ جنرل کے دفتر میں ملازم ہو گئے۔ یہ دفتر لال قلعہ کے اندر واقع تھا۔ اس طرح ان دنوں وہ روز لال قلعہ کی زیارت کرتے تھے۔ اس زمانے میں ہم محلہ ہونے کی وجہ سے مشہور اردو شاعر علامہ بےخود دہلوی سے ان کا ساتھ ہو گیا اور وہ روزانہ پابندی سے ان سے ملنے لگے۔

ربانی صاحب کا کہنا ہے کہ ان میں زبان کا صحیح ذوق علامہ بیخود کی صحبت ہی سے پیدا ہوا۔ علامہ مرحوم ان کے ساتھ بہت شفقت سے پیش آتے تھے، ورنہ ان کی سخت مزاجی اردو ادب میں مشہور ہے۔

تین سال تک اے جی آفس میں حساب کتاب کا کام دیکھتے رہنے کے بعد ربانی صاحب نے یہ ملازمت چھوڑ دی۔ کیونکہ وہ کسی طرح ان کے ذوق کا کام نہیں تھا۔ اس زمانہ میں مولانا

عـ۱ موصوف حکومت ہند کے وظیفہ یاب عہدہ دار ہیں۔ انہوں نے کوئی دس سال تک محکمۂ آثار قدیمہ میں ملازمت کی۔ تقسیم ہند سے قبل ریاست حیدرآباد میں یہ برسوں تک غارہائے الورہ و اجنتہ کے مہتمم رہے۔ وائسرائے ہند لارڈ لینتھگو کو آپ ہی نے ان غاروں کا معائنہ کروایا تھا۔ ہندستان میں ان غاروں کے بارے میں تفصیلی معلومات رکھنے والے چند لوگوں میں آپ کا بھی شمار ہوتا ہے۔ سابق صدر جمہوریہ ہند راجندر پرشاد نے بھی آپ ہی کی معیت میں ان غاروں کا معائنہ کیا تھا۔ تقسیم ہند اور ریاست حیدرآباد کے انڈین یونین میں انضمام کے بعد ان کا تبادلہ حیدرآباد ہو گیا اور وہ نگران ناظم آثار قدیمہ کے طور پر صدر دفتر میں کام کرنے لگے۔ ریاستوں کی تنظیم جدید کے بعد ان کی خدمات مرکزی محکمۂ آثار قدیمہ نے حاصل کر لیں۔ اور وہیں سے انہوں نے وظیفہ حاصل کیا۔ تاریخ، تمدن ہند اور آثار قدیمہ کے علاوہ آپ زبان و ادب کا بھی ذوق رکھتے ہیں۔ ویسے تو آپ کا وطن دامنۂ دہلی، شمالہ ہے مگر آپ نے حیدرآباد میں سکونت اختیار کر لی ہے۔ (رشید)

محمد علی جوہر کلکتہ سے انگریزی کا مشہور ہفتہ وار "کامریڈ" نکالتے تھے۔ یہ وہاں پہونچ گئے اور بحیثیت خازن کام کرنے لگے۔ اس زمانہ میں بلقان کی جنگ جاری تھی اور مولانا جوہر کے مضامین کی وجہ سے ہندستانی مسلمانوں میں ترکی کی تائید میں زبردست جوش و خروش پایا جاتا تھا اور بلقان فنڈ میں دھڑا دھڑ روپیہ جمع ہو رہا تھا جو کامریڈ کی جانب سے ترکی بھجوایا جا رہا تھا۔ بعد میں مولانا محمد علی جوہر نے کامریڈ کے ساتھ ایک اردو روزنامہ "ہمدرد" بھی جاری کیا۔ اس زمانے میں "کامریڈ اور ہمدرد" میں قاضی عبدالغفار، میر محفوظ علی بدایونی (عبدالحق صاحب کے خاص ساتھی) ضیاء الدین برنی، سید ہاشمی فرید آبادی، جالب دہلوی اور راجہ غلام حسین جیسے لوگ شامل تھے۔

ربانی صاحب نے جہاں بھی کام کیا، فرض شناسی اور احساس ذمہ داری سے کیا۔ "ہمدرد" کا دفتر اور مولانا محمد علی جوہر کی رہائش ایک ہی مکان میں تھی، ایک بار اندر سے ان کی نوکرانی نے آکر ربانی صاحب سے کہا کہ بیگم صاحبہ، صاحب کے سگار کے لئے پچیس روپیہ منگوا رہی ہیں۔" انہوں نے جواب دیا کہ "صاحب کی چٹھی لاؤ" نوکرانی اندر گئی اور پھر آکر کہا کہ "بیگم صاحبہ بہت خفا ہو رہی ہیں اور کہہ رہی ہیں کہ بغیر چٹھی کے پیسے دیدو"۔ ربانی صاحب نے انکار کر دیا اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد انہوں نے پیچھے سے اپنے کندھوں پر کسی کے ہاتھوں کا دباؤ محسوس کیا۔ انہوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو محمد علی جوہر کھڑے مسکرا رہے تھے۔ جوں ہی دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں، مولانا نے کہا "ارے بھئی! تم نے بہت اچھا کیا۔"

علی برادران (محمد علی، شوکت علی) کی گرفتاری کی وجہ سے "کامریڈ اور ہمدرد" دونوں اخبارات بند ہو گئے اور ربانی صاحب پھر بیکار ہو کر اپنے وطن چلے آئے۔ دو سال بعد کامریڈ کے ممتاز صحافی راجہ غلام حسین نے جب لکھنؤ سے اپنا ذاتی انگریزی ہفتہ وار "نیو ایرا" جاری کیا تو انہوں نے ربانی صاحب کو لکھنؤ بلا لیا اور وہ وہاں منیجر ہو گئے۔ اخبار کافی اچھا چلتا تھا اور اس زمانہ میں "کامریڈ" کا جانشین سمجھا جاتا تھا مگر ایک ٹرانک حادثہ میں راجہ صاحب کی موت کی وجہ یہ اخبار بھی بند ہو گیا۔

ربانی صاحب مولوی عبدالحق کے والد شیخ علی حسین صاحب کے ملنے والوں میں سے تھے، مولوی صاحب کے بڑے بھائی ضیاء الحق اور چھوٹے بھائی احمد حسین صاحب سے بھی ان کی ملاقات تھی۔ خصوصاً احمد حسین صاحب سے ان کے مراسم دوستانہ تھے۔ جب احمد حسن صاحب بھوپال انجینیر بن کر چلے گئے تو ایک بار ربانی صاحب بھی ان سے ملنے بھوپال گئے۔ اتفاق سے مولوی عبدالحق صاحب بھی پانی پت سے مولانا حالی کے آخری مراسم میں شرکت کرنے کے بعد اورنگ آباد واپس ہوتے ہوئے ایک دو دن بھوپال میں اپنے بھائی کے پاس ٹھہر گئے تھے، یہیں ربانی صاحب اور مولوی عبدالحق صاحب کا ایک دوسرے سے تعارف ہوا۱ اور بعد میں (۲۵) سال تک یہ ایک دوسرے کے ساتھی بن گئے۔ چونکہ ربانی صاحب ان دنوں بیکار تھے اس لئے مولوی صاحب نے انہیں بعد میں انجمن ترقی اردو (جس کے کہ وہ اعزازی معتمد تھے) کے دفتر میں کام کرنے کے لئے بلا لیا۔ اور اس طرح ربانی صاحب انجمن کے دفتر سے وابستہ ہو گئے۔ مولوی صاحب ان دنوں اورنگ آباد میں مہتمم تعلیمات تھے اس لئے انہوں نے ربانی صاحب کو تعلیمات میں ملازم بھی رکھوا دیا۔ اور وہ گورنمنٹ ہائی اسکول میں (جو کالج کے ساتھ ملحق تھا) اردو پڑھانے لگے۔

ربانی صاحب کے اس زمانے کے قابل ذکر شاگردوں میں میرے ماموں عبدالعزیز صاحب کے علاوہ (جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے) اردو کے مشہور شاعر سکندر علی وجد اور حامد علی عباسی وغیرہ

---

۱ مولانا الطاف حسین حالی کا سن وفات ۱۹۱۴ء ہے۔ اس طرح یہ واقعہ بھی ۱۹۱۴ء کا ہوا۔ (رشید)

شامل ہیں۔ وحید صاحب اپنا ابتدائی کلام انہیں کو دکھایا کرتے تھے اور انہوں نے ان کی بے حد حوصلہ افزائی کی۔ عباسی صاحب حیدرآباد کی ایک ممتاز علمی اور سماجی شخصیت ہیں۔ ان کا وطن اورنگ آباد ہے۔ یہ کئی برسوں تک حکومت آندھرا پردیش کے فینانس سکریٹری بھی رہے ہیں۔ آج کل ڈیپوٹیشن پر حیدری ٹرسٹ کے مالی مشیر ہیں۔ عباسی صاحب، بے حد سنجیدہ اور باوقار شخصیت کے مالک ہیں اور اردو زبان و ادب کا اچھا ذوق رکھتے ہیں۔ یہ ربانی صاحب کے بے حد مودب اور سعادتمند شاگرد تھے اور ان کا آج بھی یہی حال ہے۔

دن میں نوکری کرتے ہوئے ربانی صاحب رات میں دیر گئے تک مولوی صاحب کے ساتھ بیٹھ کر انجمن کا کام کیا کرتے تھے، وہاں ان کے ذمہ انجمن کی مطبوعات اور رسالہ "اردو" میں اشاعت کی غرض سے آنے والے مسودات پر ایک نظر ڈالنے کا کام تھا۔ فرہنگ اصطلاحات علمیہ کی تیاری میں بھی آپ نے مولوی صاحب کا ہاتھ بٹایا تھا جس کے دیباچہ میں مولوی صاحب نے ان کا شکریہ بھی ادا کیا ہے۔ مولوی صاحب کی شہرۂ آفاق اسٹینڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری میں بھی (جو دراصل کنسائز آکسفورڈ ڈکشنری کا ترجمہ ہے) انہوں نے کام کیا ہے۔ اس زمانہ میں پنڈت کشن دھر دیالنکار، وہاج الدین اور محمد حسین محوی اس کام میں ان کے ساتھ تھے۔ مولوی صاحب ان تمام لوگوں کو ساتھ لے کر تراجم کو قطعی صورت دیتے تھے۔ عام طور پر یہ نشست شام سے شروع ہو کر رات دیر گئے تک جاری رہتی تھی۔[۱]

اس زمانے میں انجمن کی جانب سے اردو لغت کی تیاری کا کام بھی جاری تھا۔ مولوی صاحب اردو کی پرانی کتابوں سے الفاظ نکال کر یہ لغت مرتب کرانا چاہتے تھے، چنانچہ ربانی صاحب نے بہت سی پرانی کتابوں کو پڑھ کر سینکڑوں الفاظ تلاش کئے۔ افسوس کہ یہ کام دہلی آفس میں فسادات کے زمانہ میں تلف ہو گیا۔ اسی زمانے میں ربانی صاحب نے مولوی صاحب کی فرمائش پر انجمن ترقی اردو کی سلور جوبلی کے موقع پر "انجمن کی کہانی" نامی مختصر سی کتاب لکھی جس میں انجمن کی پوری تاریخ موجود ہے۔

جو بھی شخص مولوی صاحب سے انجمن کے بارے میں کچھ پوچھتا تو وہ اسے اس کتاب کے پڑھنے کا مشورہ دیتے۔ اس کتاب کا انگریزی ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

اپنے قیام اورنگ آباد کے زمانے میں ربانی صاحب کی غلام یزدانی[۱] صاحب سے ملاقات ہوئی اور وہ ان کی صلاحیتوں اور قدیم عمارات پرانے سکوں اور تاریخ دانی کے ذوق سے بہت متاثر ہوئے اور انہوں نے ربانی صاحب کو تعلیمات سے اپنے محکمۂ آثار قدیمہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی۔ اس زمانے میں مولوی عبدالحق صاحب بھی حیدرآباد آچکے تھے اور ربانی صاحب بھی حیدرآباد آنا چاہتے تھے۔ اس لئے انہوں نے یزدانی صاحب کی اس پیشکش کو قبول کر لیا اور آثار قدیمہ میں بحیثیت مہتمم کام کرنے لگے۔ کچھ دن وہ بیدر پر بطور مہتمم بھی رہے، لیکن پھر حیدرآباد آگئے۔ اور ۱۹۵۰ء میں بحیثیت منتظم وظیفہ

۱؎ یزدانی صاحب کا شمار ہندوستان کے ممتاز ماہرین آثار قدیمہ میں ہوتا ہے۔ اس موضوع پر ان کی کئی کتابیں موجود ہیں۔ وہ سابق ریاست حیدرآباد میں برسوں تک ناظر آثار قدیمہ رہے اور انہوں نے ایلورہ و اجنتہ کی بازیافت کے بعد اس کی حفاظت اور تحقیق میں خصوصی دلچسپی لی۔ ان کا وطن دلی تھا لیکن ان کی ساری زندگی حیدرآباد میں گذری۔ [illegible] اردو کے مشہور ادیب [illegible] [illegible] کہانی [illegible] [illegible] تذکرہ [illegible] [illegible] اچھا ذوق پایا تھا۔

۲؎ مولوی صاحب کا یہ سارا کام اعزازی طور پر انجام دیتے تھے اور صرف [illegible] [illegible] [illegible]

حاصل کیا اور مستقل طور پر حیدرآباد ہی میں سکونت پذیر ہو گئے۔

ربانی صاحب کی گھریلو زندگی بے حد خوشگوار رہی اور آج بھی ہے۔ انہوں نے اپنی شادی کی گولڈن جوبلی عرصہ ہوا منائی ہے۔ مسز ربانی ایک بہت ہی خوش اخلاق خاتون ہیں اور مجھ سے اور میری بیوی بچوں سے بے حد شفقت سے پیش آتی ہیں۔ ربانی صاحب کے بڑے فرزند غلام یزدانی صاحب ہیں جو اے جی آفس حیدرآباد میں اکاؤنٹس آفیسر ہیں۔ دوسرے فرزند غلام جیلانی ہیں جو انجینیرنگ کالج عثمانیہ یونیورسٹی میں طبیعات کے ریڈر ہیں۔ یہ دونوں حضرات بھی افسانے اور ڈرامے لکھتے ہیں اور آکاشوانی حیدرآباد سے اکثر ان کی چیزیں نشر ہوتی رہتی ہیں۔ ربانی صاحب کی دو لڑکیاں تسنیم ربانی اور نسیم ربانی ہیں۔ یہ دونوں بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور اچھے گھرانوں میں بیاہی گئی ہیں۔

ربانی صاحب نے اب تک مختلف موضوعات پر سینکڑوں مضامین لکھے ہیں۔ جو زیادہ تر انجمن ترقی اردو کے سہ ماہی رسالے "اردو" اور مکتبہ جامعہ کے رسالے "جامع" میں شائع ہوئے ہیں۔ بعض مضامین چیدہ چیدہ طور پر دیگر رسائل و اخبارات میں بھی شائع ہوئے ہیں۔ ان دنوں بھی وہ حیدرآباد کے روزنامہ "سیاست" اور مکتبہ جامعہ کے رسالہ جات "جامع" اور "پیام تعلیم" میں پابندی سے لکھتے رہتے ہیں۔ "آج کل" میں بھی عرش ملسیانی صاحب کے زمانے میں کچھ مضامین شائع ہوئے ہیں۔

ربانی صاحب کے مضامین کے خاص موضوعات زبان وادب کے مسائل، آثار قدیمہ و کھدائیاں، اسکے، طرز تعمیر، مجسمہ سازی، علم فلکیات اور مصوری و موسیقی وغیرہ رہے ہیں۔ آپ کا اپنا ایک طرز تحریر ہے جو بے حد سلیس، دلکش اور موثر ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

"مولوی صاحب ضلع بیڑ کے دورہ پر تھے۔ ترل راؤ صاحب مہتمم تعلیمات تھے، وہ بھی ان کے ساتھ ڈاک بنگلہ میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ترل راؤ صاحب کو پاس کے کسی گاؤں میں کام تھا، وہ کچھ دیر کے لیے چلے گئے۔ مولوی صاحب نے ایک پلنگ پر کچھ کپڑے اور بستر ارکھ کر اس پر چادر ڈال دی اور ایک تکیہ پر کونکہ سے آدمی کا چہرہ بنا کر سرہانے رکھ دیا۔ دور سے معلوم ہوتا تھا کہ کوئی آدمی کروٹ لیے سو رہا ہے۔ کچھ دیر بعد ترل راؤ صاحب آئے۔ مولوی صاحب برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کہنے لگے، ارے بھائی تمہارے کوئی دوست تم سے ملنے آئے ہیں، وہ بہت تھکے ہوئے تھے۔ پلنگ پر لیٹتے ہی سو گئے۔ ترل راؤ صاحب نے دروازہ میں سے دیکھا تو واقعی کوئی شخص پلنگ پر لیٹا دکھائی دیا۔ جب زیادہ دیر ہوئی تو ترل راؤ صاحب اٹھ کر اندر گئے۔ چادر اٹھائی تو مطلع صاف تھا" (کچھ بابائے اردو کے بارے میں" مطبوعہ روزنامہ "سیاست" حیدرآباد)

بیشمار مطبوعہ مضامین کے علاوہ ربانی صاحب کی تصنیفات میں "انجمن کی کہانی" کے علاوہ "تاریخ ہند" (یہ تقسیم سے قبل عثمانیہ یونیورسٹی کے بی اے کے نصاب میں شامل تھی) "ہندو اخلاقیات" (یہ ایک ترجمہ ہے) اور "نہانی اردو" (یہ غیر اردو داں افراد کو اردو سکھانے والی کتاب ہے جسے ڈاکٹر بی گوپال ریڈی موجودہ گورنر اتر پردیش کی ایما پر تیار اور شائع کیا گیا ہے) شامل ہیں۔ ان کے پاس اب بھی بیشمار مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مضامین ہیں جنہیں شائع کرنے پر کئی کتابیں تیار ہو سکتی ہیں۔ ربانی صاحب نے ہندی پرچار سبھا حیدرآباد کی جانب سے مرتبہ اردو ہندی ڈکشنری اور ہندی اردو ڈکشنری کی تیاری میں بھی حصہ لیا۔ ان دنوں بھی انجمن ترقی اردو حیدرآباد کی جانب سے ترتیب دی جانے والی تلگو، اردو ڈکشنری میں وہ کام کر رہے ہیں۔

ربانی صاحب بے حد باشعور اور جہاندیدہ انسان ہیں۔ انہوں نے ۱۹۰۳ء کا دلی کا دربار بھی دیکھا جو ایڈورڈ ہفتم کی تخت نشینی کے موقع پر منعقد ہوا تھا۔ انہوں نے جارج ششم کی تخت نشینی کا دربار بھی دیکھا ۱۹۱۱ء اور ۱۹۳۹ء کی دو عظیم جنگیں بھی ان کے سامنے شروع اور ختم ہوئیں۔ انہوں نے ہندستان

کا دور جدید آزادی بھی دیکھی اور آزاد ہندستان بھی۔ انہوں نے پنڈت نہرو کا دورِ وزارت بھی دیکھا۔ اور اب ان کی بیٹی اندرا گاندھی کا دور بھی دیکھ رہے ہیں۔

ربانی صاحب بے حد منکسر المزاج، سنجیدہ، وضعدار اور شائستہ انسان ہیں، وہ ایک خاموش اور کم آمیز انسان ہیں لیکن جن کے سامنے کھلتے ہیں، خوب کھلتے ہیں اور معلومات کے خزانے بکھیر دیتے ہیں۔ ان سے ملنے کے بعد بڑا سکون اور جذباتی چین میسر آتا ہے۔ جب بھی میں ان سے مل کر لوٹتا ہوں تو مجھے مولانا حالی کا یہ شعر یاد آجاتا ہے۔

بہت جی خوش ہوا حالی سے مل کر
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

رباعیات

جگن ناتھ آزاد

مخدوم نوا طراز! کیوں ہو خاموش
ویران ہے کیوں مری نظر کا آغوش
ملنے کو بہت دور سے آیا ہوں میں
جامی واریب! تم کہاں ہو رُو پوش

اے خطۂ دلنواز و اے شہر حبیب
کیوں ہم سے خفا ہیں ترے فنکار و ادیب
کشمیر میں سروری نے منہ موڑ لیا
نظروں سے یہاں نہاں ہیں مخدوم و اریب

○

غزل

نازش پرتاب گڈھی

پوچھنا ہے غم ہستی کا بھرم رات گئے
کیوں پھرا کرتے ہیں آوارہ سے ہم رات گئے
روئے ہستی پہ جو ابھریں تو قیامت آجائے
جام اشعار میں ڈھلتے ہیں وہ غم رات گئے
روز ہنس بول کے دن کاٹ دیا کرتے ہیں
روز ہو جاتے ہیں رنجیدہ سے ہم رات گئے
لاؤ اپنے ہی در و بام سے دکھ سکھ کہہ لیں
ڈھونڈنے جائیں بھلا اب کسے ہم رات گئے
ڈس لیا روح کو ماحول کے سونے پن نے
گھر سے گھبرا کے جو نکلے کبھی ہم رات گئے
کس سے تنہائی ماحول کی لذت کہیئے
شہر میں ہوتے ہیں نازش ہمیں ہم رات گئے

○

جاں نثار اختر

ہر ایک روح میں اک غم چھپا لگے ہے مجھے
یہ زندگی تو کوئی بد دعا لگے ہے مجھے

پسندِ خاطرِ اہل وفا ہے مدّت سے
یہ دل کا داغ جو خود بھی بھلا لگے ہے مجھے

جو آنسوؤں میں کبھی رات بھیگ جاتی ہے
بہت قریب وہ آوازِ پا لگے ہے مجھے

میں سو بھی جاؤں تو کیا، میری بند آنکھوں میں
تمام رات کوئی جھانکتا لگے ہے مجھے

میں جب بھی اس کے خیالوں میں کھو سا جاتا ہوں
وہ خود بھی بات کرے تو بُرا لگے ہے مجھے

دبا کے آئی ہے سینے میں کونسی آہیں
کچھ آج رنگ ترا سانولا لگے ہے مجھے

نہ جانے وقت کی رفتار کیا دکھاتی ہے
کبھی کبھی تو بڑا خوف سا لگے ہے مجھے

بکھر گیا ہے کچھ اس طرح آدمی کا وجود
ہر ایک شخص کوئی سانحہ لگے ہے مجھے

اب ایک آدھ قدم کا حساب کیا رکھیئے
ابھی تلک تو وہی فاصلہ لگے ہے مجھے

○

لمحۂ آسودہ

ناصر کرنولی

کتنی صدیوں کے فراموش دھندلکے سے خواب
دل پر شوق کے آئینہ میں
ایک موہوم سی امید کے ساتھ
سعیٔ بے سود کا امکان لئے
جانے کس موڑ پہ تعبیر سے مل جائیں گے
جانے کب خواب حقیقت بن جائیں
وہ محبت جو کہ اک جنس گراں مایہ ہے
وقت کی زد سے نہ محفوظ رہے
ربطِ شائستہ کی قیمت نہ رہے
درد کے رشتوں کے انمول رتن
جنسِ ارزاں کی طرح بک جائیں
اتفاقات کے بازاروں میں
جھومتے جھامتے سرشار بہکتے جذبے
جانے کب تھام لیں تہذیب وفا کا دامن
ذہن میں پھر سے ابھر آئیں گذشتہ یادیں
پھر سے بدمست خیالوں کے دھندلکے چھا جائیں
ان دھندلکوں میں کوئی کیف کا لمحہ بڑھ کر
کھٹکھٹا جاتے جو زنجیر درِ تنہائی
کوئی خوابیدہ تمنا جاگے
سالہا سال کے خوابوں کا تسلسل ٹوٹے
اور اک لمحۂ آسودہ حقیقت بن جائے۔

○

مصنوعی چاند

مری محبوب، مرے چاند، مری صبحِ حسیں
اپنے ماحول کے شکووں کو ذرا رہنے دے
زندگی یوں تو پریشاں ہے جہاں میں ہر سو
مجھ کو احوالِ عزیزانِ وطن کہنے دے

بھوک، افلاس، گرانی کے مسلسل چکر
چند سرمایہ پرستوں نے چلا رکھا ہے
علم و دانش کے چراغوں میں ضیا ہو کیونکر
شب کے فرزندوں نے اندھیر مچا رکھا ہے

اپنی تخلیق کے وہ چاند اڑائیں کیوں کر
جو سیہ روز یہاں ایک کرن کو ترسیں
کیسے افلاک کے وہ چاند ستارے چھو لیں
جن پہ دن رات غم و رنج کے شعلے برسیں

یہ الگ بات کہ اس جبر و ستم کے باوصف
آج ماحول کا کچھ رنگ ہے بدلا بدلا!
چادرِ ظلمتِ شب آج ہے سمٹی سمٹی
مری محبوب، فلک پر ہے نیا چاند چڑھا

دیکھ تاریک فضاؤں کا جگر لرزاں ہے
دور افق پار سے ابھرا ہے ستارہ کوئی
دستِ محنت کا کرشمہ ہے یہ شہکارِ جمیل
اس کو سمجھے نہ فقط ایک شرارہ کوئی

شاید اب تیرگیٔ غم کا مداوا ہو گا!
اور چمک اٹھے گی اس دیس کی تاریک جبیں
آج کچھ فخر و مباہات سے مسرور ہوں میں
مری محبوب، مرے چاند، مری صبحِ حسیں

حزیںؔ لدھیانوی

عاتق شاہ

نئی کہانی

ابھی ابھی میں گھر سے آیا۔ اور گھر سے آتے ہوتے میں نے اپنے تیئں یہ طے کر لیا تھا کہ مجھے آپ کو کیا کہانی سنانی ہے۔ ویسے میری بیوی کی مسکراہٹ نے مجھے ایک لمحے کے لئے مشتعل کر دیا تھا اور میری ساری سنجیدگی جھنجھلاہٹ کی نذر ہو چکی تھی۔ گھر سے نکلتے وقت وہ میرے راستے میں آگئی جیسے ہر وفادار بیوی اپنے شوہر کے راستے میں آجاتی ہے۔ اور پوچھتی ہے کہ رات کو اب کہاں جا رہے ہو؟

لیکن جب میں نے اسے مطمئن کر دیا کہ میں کسی ایسے ویسے فالتو دوست کے ساتھ نہیں جا رہا ہوں بلکہ کہانی سنانے جا رہا ہوں تو وہ مطمین ہو گئی۔ اور اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ جو عورت کا اپنا حصہ ہوتی ہے اُس نے پوچھا، کون سی کہانی؟

میں نے کہا نئی کہانی۔ ایسی کہانی جسے تم نے کم از کم مجھ سے اب تک نہیں سنا۔ اس بات پر میری بیوی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ہنسی جو بڑی چمکیلی اور چبھتی ہوئی تھی۔ اور جو کہہ رہی تھی میں جانتی ہوں تم کیا کہانی سناؤ گے۔ وہی ایک لڑکے اور لڑکی کی پرانی کہانی۔ اس میں کچھ پیار اور محبت کی باتیں ہوں گی۔ پھر جدائی۔ اور نتیجہ میں ملاپ یا پھر کچھ گڑبڑ وغیرہ، وغیرہ۔ اس کے علاوہ کہانی کا اور کوئی موضوع بھی ہوتا ہے؟ مسکراہٹ جو کہہ رہی تھی!

میں مشتعل ہو گیا۔ برہم ہو گیا۔ اپنی بیوی سے سو فیصد ناراض ہو گیا۔ لیکن لڑائی کا موقع نہیں تھا۔ اس لئے غصہ کو پی کر اپنے چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ پیدا کرتے ہوتے میں نے کہا، نہیں مائی سوویٹ ڈارلنگ، میری کہانی اس سے ہٹ کر ہے۔

میری بیوی سنجیدہ ہو گئی۔ اور پھر اُس نے بڑے پیار سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا، تو پھر سناؤ نہ مجھے نئی کہانی۔ میں نے کہا اب نہیں۔ لوٹ کر سناؤں گا۔ اب مجھے جانے دو!

میں سیدھا اپنے گھر سے آرہا ہوں۔ مجھے اندازہ تھا

کہ آپ میرے منتظر ہیں اور آپ کی خدمت میں مجھے ایک کہانی پیش کرنی ہے۔ وہ کہانی جو میں اب آپ کو سنانے والا ہوں۔ میرے طے شدہ فیصلہ کا ایک حصہ ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ میری بیوی نے مجھے ذرا اکسا یٹ کر دیا تھا۔ ویسے یہ حادثہ نہ بھی ہوتا تو میں پچھتاتا۔ اور یوں بھی میں راستہ بھر یہی سوچتا رہا۔ اور آخر میں اس نتیجہ پر پہونچا کہ میرا فیصلہ ہر طرح سے حق بجانب ہے۔

لیکن، اب جب میں آپ کے سامنے ہوں مجھے ڈر ہو رہا ہے کہ کہیں آپ مجھ سے مایوس نہ ہو جائیں، ویسے میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میری کہانی بڑی سیدھی سادی ہے۔ ایسے ہی جیسے کوئی سیدھا سادا آدمی آپ سے ملنے آجائے۔ اور آپ پہلے ہی مرحلہ اور پہلی ہی نظر میں اسے پہچان لیں۔ اور یوں محسوس کرنے لگیں کہ جیسے آپ اسے ایک لمبے عرصہ سے جانتے ہیں۔ سچ پوچھئے تو میری کہانی میں وہ گھسی پٹی باتیں نہیں ہیں جن کا اظہار بڑی دلیری سے میں آپ کے سامنے کرتا رہا۔ اور نہ وہ عورت ہے جسے مختلف نام دے کر میں آپ کے سامنے پیش کرتا رہا۔ اور جس سے زندگی میں کبھی بھی ملاقات نہ ہوتی۔ اور نہ وہ جھلکی جھلکائی سہمی سہمائی لڑکی ہے جسے میں نے کبھی دیکھا ہی نہیں۔ اور جو صرف میرے تخیل کی وادیوں میں ایک بے چین روح کی طرح بھٹکتی رہی اور نہ وہ فرضی محبوبہ ہے جسے میں نے حقیقت کا رنگ دینے کے لئے اس کے اطراف واقعات کا ایک جال بنا تھا۔

میں آپ کو جو کہانی سنانے والا ہوں، وہ نہ کسی مرد کی ہے نہ عورت کی ہے۔ اور نہ کسی معاشقے کی۔ بلکہ اس سڑک کی ہے جو میرے گھر کے سامنے سے نکل کر میلوں دور تک چلی گئی ہے، سیدھی، ٹیڑھی، میڑھی، تنگ، وسیع اور ایک ناگن ہی کی طرح بل کھاتی ہوئی۔

سڑک جو بن رہی ہے!
سڑک جو ابھی بنی نہیں!

سڑک جو میری اور ہر اس شخص کی تقدیر ہے جو اس پر سے گذرتا ہے۔ کبھی کسی موڑ پر یہی سڑک تنگ ہو کر گلی کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور کبھی سینہ پھیلائے پڑا کر ایک وسیع دل رکھنے والے شخص کی طرح سینہ تان کر آگے بڑھ جاتی ہے۔ اور اس کے آثار چڑھاؤ کسی بیوفا عورت کے وہ راز ہیں جو کسی کی سمجھ میں نہ آسکے۔

میں ایک طویل عرصہ سے اس سڑک پر چل رہا ہوں اور اس کے ہر اونچ نیچ سے واقف ہوں۔ میں نے اسے ہر دور اور زمانے میں بدلتے، بگڑتے اور تباہ ہوتے دیکھا ہے۔ سیکڑوں اور لاکھوں انسان نہ جانے کہاں کہاں سے یہاں آتے ہیں اور ایک دوسرے کو دھکا دیتے ہوئے گذر جاتے ہیں۔ کیا مرد، کیا عورتیں، کیا بچے اور کیا بوڑھے۔ یہ لوگ کون ہیں؟ شاید سڑک سے گذرتے ہوئے یہ بات کوئی نہیں سوچتا!

لیکن میں سوچتا تھا۔ اس وقت جب میں سڑک پر نہیں آیا تھا۔ بلکہ اپنے گھر کی چھت پر بیٹھ کر سڑک کا نظارہ کرتا تھا۔ اس وقت سڑک ایک ہری بھری پگڈنڈی کی طرح بھلی معلوم ہوتی تھی اور اس پر گذرنے والے بے شمار انسان رینگتے ہوئے وہ کیڑے مکوڑے جن کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ کسی اونچی عالیشان عمارت کے کسی خوبصورت کمرے میں دریچے کے قریب بیٹھ کر سڑک کو دیکھنا ایک دلچسپ مشغلہ نہیں تو اور کیا ہے۔ خود میں برتری کا احساس پیدا کرتا ہو تو اونچے مقام سے نیچے کی طرف دیکھو، ہر شئے ادنی اور پست نظر آئے گی۔ لیکن جب میں اوپر سے نیچے آگیا، فٹ پاتھ پر آگیا تو پتہ چلا کہ کون عظیم ہے اور کون حقیر۔

یہ سڑک بڑی عجیب و غریب ہے!

اس سڑک سے میری بھی زندگی کی کئی یادیں وابستہ ہیں۔ اسی سڑک سے میری بہن دلہن بنی، شہنائیوں کی

گونج میں اپنے دلہا کے گھر گئی تھی۔ اور پھر ایک دن اسی سڑک سے اس کی میت قبرستان کی سمت روانہ ہوگی۔

مجھے یاد ہے کہ اسی سڑک کے شور و غل میں پاؤں پاؤں چلتے ہوئے میرے ننھے لڑکے طارق نے ٹھوکر کھا کر گرتے ہوئے پوچھا تھا۔

بابا — یہ گڑھا کیوں ہے؟

میں اپنے بچے کو سمجھا نہ سکا کہ سڑک پر گڑھے کیوں ہوتے ہیں لہٰذا وہ ایک دن اسی سڑک کے تاریک گڑھے میں سما گیا۔ اوپر سینوں مٹی ڈال دی گئی۔ طارق کی قبر اسی سڑک کے کنارے واقع ہے۔

سڑک میری زندگی کا ایک زخم ہے اور اس عورت کے لئے ایک ناسور جسے میں صبح و شام دیکھتا ہوں۔ یہ عورت دن بھر بیت ناپ ہوٹل کے سامنے ہاتھ پھیلائے بھیک مانگتی ہوئی نظر آتی ہے اور رات کی تاریکی میں چوراہے کے اس موڑ پر جہاں سڑک پیچھے کی طرف دیکھتی ہوئی آگے بڑھ جاتی ہے۔ کھڑی ہوئی مسکرا مسکرا کر اپنے گاہکوں کو جمع کرتی ہے!

میں اس عورت کو اس طرح جانتا ہوں کہ اس کا شوہر بھی میری کہانی کی طرح انتہائی سیدھا سادا اور شریف آدمی تھا اور جو عین جوانی میں بے روزگاری کا شکار ہو کر فاقے کرتا ہوا مر گیا۔ اور اس کی موت کے ساتھ ہی اس کے گھر کی چار دیواری دھڑام سے گر پڑی۔ دوسرے ہی لمحے وہ سڑک پر تھی!

یہاں آتے ہوئے میں نے اسے ابھی ابھی راستے میں دیکھا ہے۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھ سے پوچھا کہاں چلے۔ اتنا تیز تیز — کبھی تو خیرات دیا کرو — پیسوں کی نہ سہی محبت کی سہی!

میں نے جھنجھلا کر کہا۔ بکومت۔ ہٹ جاؤ میرے راستے سے۔ میں کہانی سنانے جا رہا ہوں۔

عورت نے جیسے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ اچھا تو تمہیں کہانی سنانا بھی آتا ہے۔ اچھا تو تم ایک کام کرو۔ اس کہانی میں مجھے بھی شامل کر لو — کیا ہرج ہے!

پھر میں نے اسے ڈانٹا، بکومت۔

تب اس نے ہنستے ہوئے پوچھا، کیوں جی! کیا میں اتنی بری نظر آتی ہوں!

میں آگے بڑھ گیا۔ لیکن میں آپ سے کیا عرض کروں کہ اس فٹ پاتھ کی شہزادی اور اس فٹ پاتھ کے شہزادوں سے میری دیرینہ ملاقاتیں ہے۔ ان میں سے بعض تو ایسے بھی ہیں جن کی ماں کا پتہ ہے اور نہ باپ کا۔ جیسے فٹ پاتھ ہی ان کا سب کچھ ہے۔ فٹ پاتھ بیسویں صدی کا سب سے بڑا معجزہ ہے۔ کئی نامعلوم بچوں کا مقدس باپ!

میں ان شہزادوں اور شہزادیوں میں گھرا ہوا کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ فٹ پاتھ نے جس دن سے سڑک کے حسن میں اضافہ کیا ہے وہیں وہ کئی لاوارث بچوں کے لئے ماں کی گود بن گیا ہے۔ مجھے وہ لمحہ یاد ہے جب ایک صبح کے ملگجے اجالے میں فٹ پاتھ پر ایک نومولود بچے کو چلاتے ہوئے دیکھا تھا اور جسے ایک گٹھری کی شکل میں لپیٹ کر بڑی احتیاط سے رکھ دیا گیا تھا۔ اور جو شاید چلا چلا کر اپنی ماں کو آوازیں دے رہا تھا کہ ماں تو کہاں چلی۔ اس طرح تو مجھے اکیلا اور تنہا چھوڑ کر کہاں جا رہی ہے۔ پتہ نہیں اس کی ماں بے رحم تھی یا فٹ پاتھ!

رات کے سناٹوں میں سڑک کے ساتھ ساتھ جیسے فٹ پاتھ بھی ایک لاپرواہ بچے کی طرح ٹانگیں پھیلا کر سو جاتا ہے اور کتنے خاموش چوکیداروں کی طرح ادھر سے ادھر ٹہلتے ہوئے جماہیاں لینے لگتے ہیں۔ کبھی کبھی کسی کے پیروں کی چاپ ابھی بھی ٹکنے لگتی ہے۔ ورنہ ہر طرف موت کی گہری خاموشی چھائی رہتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے دن اور رات کی تھکا دینے

والی مصروفیت کے بعد سڑک اپنے جسم جسم کے ساتھ فٹ پاتھ کے ساتھ سو رہی ہے۔

لیکن دن کے اجالے میں یہ سڑک کتنی خوفناک اور یہ فٹ پاتھ کتنا خطرناک ہو جاتا ہے۔ پتہ نہیں کب کوئی اسکوٹر ٹکر دیدے اور کب کوئی بس یا لاری روندتی ہوئی زناٹے سے گذر جائے۔

اس سڑک سے گذرتے ہوئے قدم قدم پر موت کا احساس ہوتا ہے۔ پرسوں ہی کی بات ہے کہ میں نے ایک نوجوان کو دیکھا۔ ایک نوجوان جو لاری کے پچھلے پہیہ میں کچلا جا کر اپنا سب کچھ کھو چکا تھا۔ اپنے خواب، اپنی جوانی اور اپنی زندگی، سڑک خون سے لت پت تھی۔ ہر شخص افسوس کر رہا تھا۔ لیکن نوجوان کے چہرہ پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ البتہ اس کی ادھ کھلی آنکھوں میں ایک سوال تھا کہ سڑک پر اتنے گڈھے کیوں ہیں؟ یہ بند کیوں نہیں کئے جاتے؟

ساتھ ہی مجھے اپنا طارق یاد آگیا اور وہ سب چھوٹے چھوٹے کام دھندے کرنے والے جو بارش کے موسم میں گڈھوں کا رونا روتے ہیں۔ مثلاً وہ خوانچہ والا، کیلے بیچنے والا، سیکل کا پنکچر درست کرنے والا اور ہر وہ شخص جو یہاں سے گذرتے ہوئے اپنی جان کو ہتھیلی میں لئے جاتا ہے!

اس سڑک کی عمر کے بارے میں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہر زمانے میں اس کی تعمیر ہوتی رہی۔ کبھی یہاں تارکول سے اسے ٹھیک کیا گیا۔ تو کبھی اس کے سینہ میں کنکریٹ بھر کر سخت بنایا گیا۔ اور کبھی سمنٹ بچھا کر اسے چکیلی بنایا گیا۔ لیکن یہ سڑک مکمل طور پر کبھی نہیں بنائی گئی۔ صرف اس کے جسم کے آپریشن کئے گئے، اور جہاں ضرورت سمجھی گئی پیوند لگائے گئے۔ ورنہ گڈھے کہیں نہ کہیں اپنی جگہ پر باقی رہے۔

سینکڑوں جوان، بوڑھے، بچے، مرد اور عورتیں، سب یہاں سے گذرتے ہیں۔ اور پھر ایک نہ ایک دن کسی نہ کسی گہرے گڈھے میں گر پڑتے ہیں اور پھر گر کر کبھی باہر نہیں آتے، لیکن یہ گڈھے کب بند ہوں گے۔

وہ عورت پوچھ رہی ہے۔ نوجوان پوچھ رہا ہے، سب ہی پوچھ رہے ہیں۔ لیکن سڑک خاموش ہے۔ سڑک کیا کوئی بھی اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ یہ بات سڑک کو نہیں معلوم بلکہ اس انجینیر کو معلوم ہے جس نے سڑک بنائی۔ اور جو سڑک بناتا ہے۔ یہ سڑک جو بوڑھی ہو چکی ہے اور جسے بنے ہوئے ایک صدی ہو چکی۔ دو صدی، نہیں ہزار سال بیت چکے۔ یہ سڑک جو اپنی جگہ ایک تاریخ ہے۔ زمانہ ہے۔ اور ان کی تہذیب کی ایک نہ ختم ہونے والی داستان۔ اب اس داستان کو بدلنا ہے۔ اس سڑک کو نئی بنانا ہے۔

ابھی آتے ہوئے میں نے دیکھا اور یہاں سے جاتے ہوئے پھر دیکھوں گا کہ سڑک بن رہی ہے۔ اس کو بنانے والے بڑے بڑے انجینیر نہیں بلکہ وہ چھوٹے چھوٹے غریب اور معمولی لوگ ہیں جو سڑک پر کام کر رہے ہیں اور انہوں نے تعمیر کا کام شروع کر دیا ہے۔ یہاں تک کہ حادثوں کو روکنے کے لئے ایک لال قندیل چوراہے پر لٹکا دی ہے کہ سڑک پر کام ہو رہا ہے۔ خبردار ــ خبردار ــ!!

اور مجھے یقین ہے کہ ایک دن آئے گا جب کوئی طارق اپنے باپ سے یہ نہیں پوچھے گا کہ سڑک پر گڈھے کیوں ہوتے ہیں۔

ہو

مٹو

اے پی چیکھو
ترجمہ صبا ہزاری باغوی

حاصلِ فن

کاغذ میں لپٹی ہوئی شئے کو بغل میں دبائے ، سشاسمیرنو (Shasha Smirnov)، جو اپنی ماں کی ایک ہی اولاد ہے، ڈاکٹر صاحب کے آفس میں داخل ہوا

" کیا ہے بیٹے" ؟ ڈاکٹر صاحب نے گرم جوشی سے کہا۔ آج تمہاری طبیعت کیسی ہے ؟ کیا کوئی خوشخبری لائے ہو ؟

" میری ماں نے تسلیم کہا ہے اور آپ کا شکریہ ادا کیا ہے ..... میں اپنی ماں کا ایک ہی لڑکا ہوں اور آپ نے میری جان بچائی ہے ..... اور ہم لوگ سمجھ نہیں پاتے کہ کس طرح آپ کا شکریہ ادا کریں۔

سشا نے تتلاتے ہوئے کہا۔

" آؤ آؤ میرے دوست، ہمیں اس انداز میں نہیں سوچنا چاہیئے ۔ میری جگہ اگر کوئی دوسرا ہوتا تو وہ بھی یہی کرتا جو میں نے کیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے خوش مزاجی کا اظہار کیا ۔

" میں اپنی ماں کا ایک ہی لڑکا ہوں ... ہم لوگ غریب ہیں اس لئے کوئی معاوضہ نہیں دے سکتے ..... پھر بھی ہم لوگوں کی شکر گزاری کا ثبوت سمجھ کر یہ تحفہ قبول فرمائیں ....

یہ ایک کمیاب شئے ہے، زمانۂ قدیم کی دستکاری کا ایک نادر نمونہ ہے۔"

نہیں بیٹے" یہ بالکل غیر ضروری ہے ۔ مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں"۔

" اوہ نہیں نہیں" سشا نے تتلاتے ہوئے کہا۔" میں التجا کرتا ہوں آپ اسے قبول فرمائیں۔

وہ کاغذ میں لپٹی ہوئی شئے کو کھولنے لگا۔ ساتھ ہی وہ کہتا جارہا تھا۔

" اگر آپ اسے قبول نہ کریں گے تو مجھے اور میری ماں کو رنج ہوگا ..... یہ فن کا ایک نادر نمونہ ہے ۔ میرے والد کی چھوڑی ہوئی ایک بیش بہا نشانی ہے وہ کانسے کی مورتیاں خرید کر بت تراشی کے شائقین کو بیچا کرتے تھے .... اور اب میں اور میری ماں یہی کاروبار کرتے ہیں۔

سشا نے کاغذ میں لپٹی ہوئی شئے کو کھول کر ڈاکٹر کے ٹیبل پر رکھ دیا۔

یہ کانسے کا بنا ہوا ایک ارزاں چراغ دان تھا ، زمانۂ قدیم کی دستکاری کا عمدہ نمونہ ! ۔ اس پر عورتوں کی دو

مورتیاں بنی ہوئی تھیں جن کا پوسٹ کی مدر ایو (MOTHER EVE) کے زمانے کا معلوم پڑتا تھا۔ یہ مورتیاں بڑے ہی جذباتی انداز میں مسکرا رہی تھیں اور جھک کر ایسا منظر پیش کر رہی تھیں کہ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ جس کے خیال ہی سے مجھے شرم محسوس ہوتی ہے۔

جب ڈاکٹر نے تحفے کو دیکھا تو اس کے ماتھے پہ سلوٹیں ابھر آئیں۔ اس نے گلا صاف کیا اور ناک سکیڑتے ہوئے بولا۔

" بیشک فن کا ایک خوبصورت نمونہ ہے۔ لیکن یہ میرے لئے ناقابل استعمال ہے۔ ۔ ۔ ۔ تم خود سمجھ سکتے ہو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کبھی شیطان نے بھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تمہیں بتاؤ، میں اسے گھر میں کس طرح رکھ سکتا ہوں۔

"کیوں ڈاکٹر صاحب آپ فن کے متعلق ایسی رائے کیوں رکھتے ہیں۔ ستنا نے قدرے ناراضگی کے انداز میں کہا۔ " یہ فن کا ایک خوبصورت نمونہ ہے۔ ذرا اسے دیکھئے تو! اس کی خوبصورتی ایسی ہے کہ دیکھتے ہی انسان اپنے آپ میں مسرت سی محسوس کرنے لگتا ہے"

" میں یہ سب اچھی طرح جانتا ہوں میرے بچے" ڈاکٹر نے کہا " لیکن میں ایک شادی شدہ آدمی ہوں۔ میرے بچے اس کمرے میں آتے جاتے رہتے ہیں۔ اور پھر عورتیں بھی یہاں اکثر آتی رہتی ہیں۔

بیشک۔ ستنا نے کہا " آپ اگر اسے اژدہام کی نظروں سے دیکھیں گے تو فن کا یہ خوبصورت نمونہ کچھ اور ہی نظر آئے گا۔ لیکن آپ ایسے نہیں ہیں ڈاکٹر، اسی لئے ہم آپ کو اپنی سب سے پیاری چیز دے رہے ہیں۔

" شکریہ میرے دوست، شکریہ ۔ ۔ ۔ ۔ تم اپنی ماں کو میرا سلام کہنا اور یہ بھی کہنا۔

" اب کچھ نہ کہئے گا! ستنا نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔" چراغ دان کو ٹھیک یہاں گلدان کے پاس رکھئے گا۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ کو دینے کے لئے میرے پاس اس کا دوسرا جوڑا نہیں۔ اس لئے مجبوری ہے۔ اچھا ڈاکٹر صاحب الوداع!"

ستنا کے جانے کے بعد ڈاکٹر نے پھر اس چراغ دان پہ نظر ڈالی اور اس کے ماتھے پر سلوٹیں ابھر آئیں۔۔۔

یہ بہت خوبصورت ہے۔ ٹھیک ہے۔ اس نے سوچا۔ "اسے پھینک دینا ٹھیک نہ ہوگا۔ ۔ ۔ لیکن میں اسے رکھ بھی تو نہیں سکتا۔ ۔ ۔ ۔ کون ایسا شخص ہو سکتا ہے جسے میں اسے بطور تحفہ دے سکوں؟

کافی غور و فکر کے بعد اسے اپنے وکیل دوست کی یاد آئی۔

جس نے اس کے لئے قانونی خدمات انجام دی تھیں۔

دوست ہونے کے ناطے میں اسے روپے تو نہیں دے سکتا۔

اس لئے یہ بطور تحفہ پیش کر دونگا۔

وہ غیر شادی شدہ بھی ہے اور رنگین مزاج بھی۔ ۔ ۔ ۔

ڈاکٹر بڑبڑایا۔

یہ خیال آتے ہی ڈاکٹر نے اپنے وکیل دوست کے گھر کا رخ کیا۔

گڈ مارننگ دوست۔ میں تمہارا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں۔ ۔ ۔ ۔ میں جانتا ہوں، تم روپے لینا پسند نہیں کرو گے اس لئے میں تمہیں ایک کمیاب شئے بطور تحفہ دوں گا۔ ۔ ۔ ۔ ڈاکٹر نے تحفہ ٹیبل پہ رکھتے ہوئے کہا۔ "کیوں ہے نا لاجواب؟"

جیسے ہی وکیل صاحب کی نظر اس پر پڑی وہ اس کی خوبصورتی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

" کیا خوب شئے ہے! اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ " کتنی من موہک ہے۔ کہاں سے مل گئی تمہیں؟"

لیکن جلد ہی اس کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا اور وہ ڈرا ڈرا سا نظر آنے لگا۔ خوفزدہ نظروں سے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے کہا۔۔۔

" لیکن میں اسے قبول نہیں کر سکتا میرے دوست، تم اسے اپنے ہی ساتھ لیجاؤ۔"

"کیوں؟" ڈاکٹر نے چونک کر پوچھا۔

"اس لئے۔۔۔ اس لئے کہ۔۔۔ میری ماں اکثر یہاں آتی ہے۔ میرے موکل بھی آتے رہتے ہیں۔۔۔ اور ان کے علاوہ میرے ملازمین میرے متعلق کیا سوچیں گے۔"

"نہیں ایسا نہ کہو"! تمہیں اسے قبول کرنا ہی پڑے گا! دیکھو، کتنی حسین شئے ہے! کیا انداز ہے، کیا اظہار ہے۔۔۔۔ اگر تم اسے قبول نہ کروگے تو مجھے رنج ہوگا!"

اس کے بعد ڈاکٹر نے کچھ بھی سننے سے انکار کر دیا اور تیزی سے وکیل صاحب کے مکان سے نکل آیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ چلو تحفے سے نجات ملی۔

ڈاکٹر کے جانے کے بعد وکیل صاحب نے پوری توجہ سے اس چراغ کو دیکھا اور پھر کافی غور و فکر کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہونچا کہ اس تحفہ کو بطور تحفہ کسی دوست کو دیا جائے۔۔۔۔۔۔۔ آج ہی شام کو میں اسے نقال شو تکین کو دے آؤنگا۔ وہ مرد دو ان چیزوں کا دیوانہ ہے۔

تمام شام شو تکین کے کمرے میں اس تحفہ کو دیکھنے والوں کی بھیڑ لگی رہی۔ اس دوران میں کئی بار ان کی ہنسی گونجی۔ ایسا لگتا جیسے گھوڑے ہنہنا رہے ہوں۔

اس تماشے کے بعد نقال نے سوچا ـــ "اب مجھے اس کا کیا کرنا چاہیے؟ میں ایک خانگی مکان میں رہتا ہوں! اداکارائیں اکثر آتی رہتی ہیں! اور یہ ایسی چیز ہے جسے صرف ڈرائنگ روم میں بند کر کے رکھا جا سکتا ہے نا"

"آپ اسے فروخت کیوں نہیں کر دیتے۔"؟ ہیر ڈریسر نے اپنی رائے ظاہر کی۔ "ایک بوڑھی عورت کانسے کی مورتیاں خریدتی ہے"۔۔۔۔ اس کا نام سمیر نوف ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ بہتر ہوگا کہ آپ وہاں جائیں۔ مکان کا پتہ آسانی سے چل جائیگا۔ ہر کوئی اس کو جانتا ہے۔

نقال نے اس کی رائے پر عمل کیا۔

دو دن بعد ڈاکٹر اپنے ایک ہاتھ کے سہارے سر ٹیک کر دوا بنانے میں مشغول تھا۔ اچانک دروازہ کھلا اور ساشا اندر داخل ہوا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔۔۔۔۔۔۔ اخبار میں لپٹی ہوئی کوئی شئے اس کے بغل میں دبی ہوئی تھی۔

"ڈاکٹر صاحب" اس نے کہا "میں بہت خوش ہوں! میں نے خوش قسمتی سے آپ کے چراغ کا جوڑا حاصل کر لیا ہے۔ ماں بھی بہت خوش ہے! میں اپنی ماں کا ایک ہی لڑکا ہوں نا۔۔۔۔۔۔۔ آپ نے میری جان بچائی ہے!"

اور یہ کہکر ساشا نے ڈاکٹر کے سامنے ایک چراغ دان رکھ دیا۔ ڈاکٹر کا منھ حیرت سے کھلا ہی رہ گیا۔

اس کی زبان سے ایک لفظ بھی نکل نہیں سکا۔

یوں محسوس ہوا جیسے اس میں بولنے کی طاقت ختم ہو چکی ہے۔

طنز و مزاح

احسن علی مرزا

فارغ البالی

★ یہ مضمون ۲۵ اپریل ۱۹۷۱ء کو اردو مجلس کے اجلاس میں پڑھا گیا۔

(۱)

اردو مجلس کی روح رواں جناب یٰسین علی خاں صاحب نے مجھ سے خواہش کی تھی کہ میں خالصتاً غیر سیاسی مضمون پیش کروں۔ میں سماج کے ان تمام باشعور، اور کارکرد طبقات سے بالاتر ہوگیا ہوں جن کے لئے ہماری حکومت، اور ہمارے بیشتر سیاسی قایدین سیاست کو شجر ممنوعہ قرار دیتے ہیں۔ ان کے معیار کے مطابق، میری طرح ہی کے معمر، نحیف و نزار، اور خستہ و نیم جاں اصحاب کو سیاست میں حصہ لینا چاہئے۔ اس کے باوجود میں نے جناب یٰسین علی خاں صاحب کا دل توڑنا مناسب نہ سمجھا۔ اور خدا کو حاضر و ناظر جان کر عرض کرتا ہوں کہ میں جو مضمون پیش کر رہا ہوں وہ خالصتاً غیر سیاسی ہے۔ اس پر ادب برائے زندگی تو کجا، ادب برائے ادب کا بھی اطلاق نہیں ہوتا۔ یہ "ادب برائے تضیع اوقات" ہے۔ اور اگر آپ کو تضیع اوقات مقصود ہے تو صبر و سکون سے سماعت فرمایئے۔

(احسن علی مرزا)

میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ میرے سر میں اتنے ہی بال ہیں جتنے کہ آرگنایزیشن کانگریس میں سوشلسٹ۔ لیکن جس طرح مسٹر نجلنگپا کو وقفہ وقفہ سے سوشلزم کی دُہائی دینی پڑتی ہے۔ اسی طرح مجھے بھی سال میں کم از کم دو تین مرتبہ تو ہیر کٹنگ سیلون کا رخ کرنا اور کسی ٹان سوریل آرٹسٹ کے آگے سر جھکانا پڑتا ہے۔ اصلاح

خانوں کی نوعیت و ہیئت بھی، زمانہ اور وقت کے ساتھ بدلتی جارہی ہے۔ میرے بچپن میں، حجام ہر محلہ کی کسی ایسی گلی میں اپنی متحرک دوکان کھول کر بیٹھ جایا کرتے تھے۔ جہاں دو چار، سایہ دار درخت موجود ہوں۔ ضرورت مند آتے اور اپنی گردن حجام کے حوالہ کر دیتے تھے۔ متمول اور ثقہ لوگوں کو زیر شجر حجامت کا یہ عامیانہ طریقہ پسند نہ تھا۔ اور اسی لئے حجام خود

ان کے در دولت پر حاضر ہو کر اپنے ہاتھ کی صفائی کا مظاہرہ کرتے اور ہر مہینہ بدل اشتراک اور حق خدمت پایا کرتے تھے، لیکن فلک کج رفتار نے دنیا کے سبھی شعبوں اور پیشوں کے ساتھ فن حجامت کے خد و خال بھی یکسر بدل دیئے۔ تاہم آج بھی شہر کی ٹھنڈی سڑکوں پر روایتی اور افسانوی حجام ضرور مل جائیں گے۔ لیکن حجاموں کی ماڈرن نسل، ان آثار قدیمہ کو اپنا ہم پیشہ قرار دینے میں تامل اور ہچکچاہٹ محسوس کرتی ہے اور ان کے گاہکوں میں اب اشرف المخلوقات کے بجائے بھینسیں، اعلیٰ ذات کے گھوڑے اور اسی قبیل و قماش کے پالتو قدر یا دکناں جان دار نظر آتے ہیں۔ البتہ عقیقہ کے موقع پر ان ہی کو زحمت دینی پڑتی ہے۔ کیونکہ ہیر کٹنگ سیلون کے مالک ماڈرن حجام، اس قسم کی خرافات میں اپنا وقت ضائع کرنا نہیں چاہتے۔ ایک ماڈرن حجام نے ایک بچہ کے والد بزرگوار کو اس سلسلہ میں بھری دوکان میں جس طرح شرمسار کیا تھا اس کی تفصیلات مجھے آج تک یاد ہیں۔ اور اب بھی میرے ذہن پر اس "مظلوم" باپ کا "قابل رحم" چہرہ ابھر رہا ہے۔ انہوں نے بڑی عاجزی سے کہا "بھئی نیگ — میں سوا روپے کے بجائے ڈیڑھ روپیہ لے لو۔ بچہ کے ہاتھ میں چاندی کے کڑے پڑے ہیں۔ اسے بھی نذر سمجھو" مگر اس شقی القلب کا دل نہ پسیجا۔ اور اس نے بڑے اکھڑپن سے جواب دیا۔ حضرت سوا روپیہ تو ایک شیو کا مل جاتا ہے" رہ گئے کڑے، سو یہ دردسر کیوں مول لوں۔ جہاں دواؤں میں تک آمیزش ہوتی ہے، وہاں نذر نیاز کے کڑوں کا کیا بھروسہ! جس پیر کے نام سے آپ نے کڑے، اپنے بچہ کے ہاتھ میں ڈالے ہوں گے وہ اسے دھرم کانٹے پر تلوانے اور اکوانے سنے تو رہے؟۔

بچہ کے والد منہ لٹکائے چلتے بنے۔ اور مجھے یقین ہے کہ جھاڑ کے نیچے والے کسی حجام نے حاجت روائی کی ہوگی۔ لیکن اسے کیا کیجئے کہ ہیر ڈریسنگ سیلون کی درباری فضا سے بیزارگی کے زمانہ میں بھی اس روایتی حجام سے اجرائی کار کی ہمت پیدا نہیں کر سکا۔ یہ داستان بھی کچھ کم قابل ذکر نہیں کہ آخر میں پیشوا بھارتی اسٹائل کے زیر درخت اصلاح خانوں سے اتنا گھبراتا کیوں ہوں۔

بہت عرصہ پہلے کی بات ہے کہ ایک دن صبح سویرے مجھے آرائش گیسو کا خیال آیا۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس وقت میرا شہر "نیشنل کورٹ" نہیں بنا تھا۔ میں نے اپنے محلہ کے چاروں اصلاح خانوں میں جھانک کر دیکھا۔ کرسیوں، بنچوں اور یہاں تک کہ سیڑھیوں پر "صف اعدا" لگی تھی۔ کسی کو کیو توڑنے کی اجازت نہیں۔ حساب لگا کر دیکھی تو پتہ چلا کہ اپنی باری آنے تک پورا ڈیڑھ گھنٹہ لگے گا۔ ادھر دفتر میں بڑے صاحب کی لال لال آنکھیں جیسے مجھے گھور رہی تھیں۔ بال ترشوانے کے لئے "قطع روزگار کی" شرط کیسے قبول کرتا۔ مایوس ہو کر پلٹ رہا تھا کہ فٹ پاتھ پر برگد کے پیڑ کی چھاؤں میں ایک فری لانس باربر نظر آیا۔

مصدر وقار و تمکنت، پسلی پر استرا پھیرتا! بیڑی کے کش اڑاتا!! دور ہی سے وہ شاید میری حرماں نصیبی اور مایوسی کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ اس نے پہلے تو بڑی نفرت انگیز نگاہوں سے مجھے دیکھا پھر اس کی نظر یکایک بدل گئی۔ اور زبان بے زبانی سے اسی نظر نے مجھے حاجت روائی کا پیشکش کیا۔ سڑک پر اتنی بھیڑ نہ تھی۔ "علی الصباح چوں مردم بہ کار و بار روند" والی کیفیت طاری تھی۔ میں نے ادھر ادھر دیکھ کر اطمینان حاصل کر لیا کہ راہگیروں میں میرا کوئی شناسا شامل نہیں۔ حجام کے آگے زانوئے ادب تہہ کرنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ کسی نے بڑے زور سے سلام علیکم کہہ کر کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ پلٹ کر دیکھتا ہوں تو کوئی اور نہیں بڑے ساڑھو صاحب ہیں! ناگہانی افتاد سے بچ جانے پر دل ہی دل میں بارگاہ ایزدی کا شکر ادا کرتے ہوئے ان سے ان کی اہلیہ محترمہ اور نصف درجن بچوں کی خیر و عافیت دریافت کرنے لگا۔ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ اگر یہ حضرت مجھے زیر شجر حجام کے آگے سر تسلیم خم

کے دیکھ لیتے تو سسرال میں کیا منھ دکھاتا۔

"رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت"

ساہو صاحب رواروی میں تھے، انہوں نے پھر کسی وقت گھر آنے کا وعدہ کر کے اپنا راستہ لیا اور دوسری دفعہ میں نے زیادہ محتاط انداز میں اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالی۔ اس مرکز تعلق سے جہاں فری لانس حجام بڑی آن بان سے براجمان تھا، دور تک جاکر میں نے پورا اطمینان حاصل کر لیا کہ سڑک سے گذرنے والوں میں میرا کوئی دوست یا دشمن شامل نہیں ہے۔ اب کی دفعہ میں کچھ دیر یوں ہی فٹ پاتھ پر اکڑوں بیٹھا رہا اور جب پندرہ منٹ تک بھی کوئی جانی پہچانی آواز کسی گوشہ سے سنائی نہ دی تو میں نے کھدک کھدک کر شہنشاہ نقرافون تک پہونچنے کی کوشش شروع کر دی تاکہ اس اثنا میں کوئی ملاقاتی مل بھی جائے تو کہہ سکوں کہ بھائی پیروں کی رگیں کھنچنے لگی ہیں اور ڈاکٹر صاحب نے صبح سویرے تھوڑا بہت کھدک لینے کی ہدایت کی ہے سو میں وہی کر رہا ہوں۔ ایک، دو، تین بار کھدک کر میں اپنے حاجت روا کے دربار عام کے احاطہ میں داخل ہی ہونے والا تھا کہ ایک نسوانی آواز آئی۔ "آداب عرض کرتی ہوں، یہ صبح صبح آپ یہاں کیا کر رہے ہیں!"

الٰہی خیر! میری چھوٹی لڑکی کی ٹیوٹر! اس کی ٹیوشن فیس بھی واجب الادا۔ کھسیانے پن میں کچھ نہ سوجھا تو میں نے ایک دوست کے انتظار کا بہانہ کر دیا۔ دوست کا انتظار فٹ پاتھ پر بیٹھ کر! بیچاری، غالباً یہ سمجھ کر کہ اچھا خاصہ آدمی پاگل ہو گیا ہے۔ فیس کے تقاضہ کے بغیر ہی چلتی بنی۔

ان تلخ تجربات کے بعد، نئے تجربہ کی ہمت کیسے ہو؟ اب تو ہیر کٹنگ سیلون ہی پر قناعت کر لیتا ہوں۔ اور سچ پوچھئے تو اب سیلون کی فضا سے مطابقت بھی پیدا کر چکا ہوں۔ دل کی بات سناؤں، اب تو یہ بھی سوچنے لگا ہوں کہ اکسٹرا ٹائم میں شہر کے کسی بڑے سیلون میں چانس مل جائے تو معلومات کے ساتھ ساتھ آمدنی میں بھی تھوڑے بہت اضافہ کی صورت پیدا ہو جائے، "فن حجامت" سے اس دلچسپی اور دلبستگی کا نتیجہ یہ ہے کہ میں اکثر اوقات اپنی باری آنے پر بھی، کاروباری حضرات کو چاروں ابرو کے صفائے کا موقع دے کر سیلون میں پڑے ہوئے نئے پرانے اخبارات و رسائل کے مطالعہ میں کھو جاتا ہوں، یہ مصروفیت میرے لئے بڑی منفعت بخش بھی ثابت ہوئی ہے۔ چنانچہ سیلون ہی میں، میں نے کسی صاحب کے نیم پاگل "یوسف گم گشتہ" کی تصویر دیکھی اور یہ اعلان پڑھا تھا کہ ان کی کھوج لگا کر ان کے بے چین و بے تاب والدین تک پہونچانے والے کو مبلغ پانسو روپے بطور انعام دئے جائیں گے، میں نے تین دن کی تلاش کے بعد "یوسف گم گشتہ" کو ایک سنیما گھر کے شوکیس میں لگی ہوئی تصویروں سے آنکھیں سینکتا ہوا پکڑ لیا اور اسے بمشکل تمام، پولیس سے مدد لئے بغیر ان کے گھر بھی پہونچا دیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان کے پتاجی نے جو ایک بڑے سیٹھ ہیں، میرے ہاتھ میں صرف پچاس روپے تھما دئے اور میرے احتجاج پر یہ دلیل پیش کر دی کہ سہو کتابت سے اخبار میں (۵۰) روپے کی بجائے (۵۰۰) روپے کا آنکڑہ چھپ گیا ہے۔ میں نے کل کی مرغی کی بجائے آج کے انڈے پر قناعت مناسب سمجھی اور دل ہی دل میں سیلون اور اس کے مالک کے حق میں دعائے خیر کرتا ہوں۔ سوچئے تو سہی سیلون سے دلبستگی پیدا نہ کرتا اور اس سے بطور لائبریری استفادہ نہ کرتا تو (۵۰) روپے بھی کہاں ملتے۔ بات کہاں سے کہاں نکل گئی، میں تو آپ کو اصلاح خانہ میں دو گھنٹوں کی سرگزشت سنانے چلا تھا اور فن حجامت کی تاریخ، ثقافت و تہذیب میں اس کے مقام و موقف اور اس کی افادیت و اہمیت پر ایک باقاعدہ مقالہ سنانے جا رہا ہوں۔ دراصل میں اس مضمون کو ایک مقالہ ہی بنانا چاہتا ہوں، آپ نے بھی یہ خبر پڑھی ہوگی کہ بات سمندر پار نہیں بلکہ دہلی میں جو دور نہیں رہی ہے۔ چند

عظیم الشان اور بھاری بھرکم گنجوں نے بالڈینا انٹرنیشنل کے نام سے ایک بین الاقوامی تنظیم کھڑی کر دی ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ بالوں سے تعلق رکھنے والے ہر موضوع پر مقالے لکھے جائیں۔ گنجے پن کے اسباب و علل پر بہترین مقالے کو تو "گولڈ میڈل" بھی دیا جانے والا ہے۔ "گنجوں" اور گنجے پن کے متعلق بعض معلومات میں نے اپنے پسندیدہ سیلون میں گھنٹے گذار کر حاصل کی ہیں اور اسی مطالعہ ظاہر و باطن سے میں آپ کو بھی اکتسابِ فیض کا موقع فراہم کرنا چاہتا ہوں تاکہ اگر کسی مرحلہ پر آپ کی چندیا بھی صاف ہونے لگے تو آپ اسے چمکا، دمکا کر "جامِ جہاں نما" بنا لیں۔ اور اس گنبدِ صفا پہ آپ کو ماضی، حال اور مستقبل کی پرچھائیں بہ آسانی نظر آنے لگیں۔

"گنجے پن" اور "انقلاب" میں بہت سی باتیں مشترک ہوتی ہیں۔ جس طرح انقلاب ایک رات میں نہیں آتا بلکہ اس کے پیچھے برسوں کی جد و جہد کارفرما رہتی ہے۔ اسی طرح گنجے پن کا اعزاز بھی اچانک اور یکایک نہیں مل جاتا۔ دھیرے دھیرے چندیا صاف ہوتی رہتی ہے۔ اور پھر ایک دن آپ کو پتہ چلتا ہے کہ آپ گنجوں کی برادری میں شامل ہو گئے ہیں۔ اکثر صورتوں میں قدرے گرم مزاج رفیقۂ حیات کے دستِ حنائی سے گنجے پن کا پراسس شروع ہوتا ہے۔ مشکل تو یہ ہے کہ جن کرم فرماؤں کو اس قسم کے رومانٹک مرحلے سے گذرنا پڑتا ہے وہ حقیقت کو چھپا کر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ گنجا پن ایک مرض ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں مجھے جی غالب کی جرأت و بیباکی کا اعتراف کرنا پڑے گا۔ جنہوں نے اپنی "سراپا ناز" کے شیوۂ متانت کے تذکرہ کے ساتھ ساتھ اپنی حرکتوں کے ردِّ عمل کے طور پر اپنے بالوں کی کھیتی اجڑنے پر ملال دکھایا ہے۔ بہرحال یہ ایک حقیقت ہے کہ گنجے پن کے محرکات سو فیصد داخلی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ اور ادارہ اقوامِ متحدہ بھی اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ کسی رکن کے داخلی معاملات میں مداخلت کی جائے۔ بال تو بال ہیں دنیا کے کتنے ہی ممالک میں انسانوں کی نسلیں اجاڑی جارہی ہیں لیکن اقوامِ متحدہ کے سکریٹری جنرل اوتھانٹ اپنے قیمتی کوٹ کا دامن آلودہ کرنا نہیں چاہتے۔ بہتر تو یہ ہے کہ آپ اور میں دونوں ہی گنجوں کی "درونِ خانہ" مصروفیات کو عام محفلوں کا موضوعِ بحث نہ بنائیں لیکن یہ بات ضرور نوٹ کر لیجئے کہ گنجے پن کے اسباب و علل کی تحقیقات کے سلسلہ میں بنتِ حوا کی پتلی پتلی انگلیوں کو شک و شبہ کی نظروں سے دیکھا جا رہا ہے تحقیقات کے بعد ہی پتہ چل سکیگا کہ جو انگلی خوبصورت انگشتری کی مستحق سمجھی جاتی رہی ہے اس کی تباہ کاریوں کا میدان کتنا وسیع ہے اور جو ہاتھ گہوارہ کی ڈوری کھینچنے کے لئے بنائے گئے تھے وہ کس بے دردی سے اپنی جنسِ مخالف کی تالو صاف کر رہے ہیں۔ مجھے اس بات کا اندازہ اس وقت ہوا جبکہ میرے ایک جگری دوست نے جن کے بارے میں میرا خیال تھا کہ غالباً حقیقی اپنے اس شاہکار کو بال لگانا بھول گیا ہے۔ ایک دن بڑے ہی دلخراش انداز میں اپنی داستانِ حیات سنائی اور اپنی رفیقۂ حیات کی رومانٹک چپتوں کے اثراتِ مابعد کی تفصیلات سے واقف کرایا۔ اس بیچارہ نے اجڑی ہوئی چندیا کی بازآبادکاری کی بہتیری کوشش کی۔ لیکن بے فائدہ! تعویذ گنڈے کئے۔ عطائی نسخے آزمائے، انتہا یہ کہ ایک دفعہ ایک نیم حکیم نے مالش کے لئے ایک ایسی دوا بھی دی جسے لگانے پر ایسا محسوس ہوا کہ جیسے ہزاروں بچھو سر پر ڈنک مار رہے ہیں۔ بالوں کی دولت کی بازیابی کی امید میں یہ اذیت بھی برداشت کر لی گئی۔ لیکن چندیا پر ایک بال بھی نہ اگ سکا۔ مالش کے دوران دوائی کے آنکھ میں چلے جانے سے ایک عرصہ تک بینائی سے بھی محروم رہے۔ اب تو

"ہرچہ از دوست میرسد نیکوست"

کے مقولہ کی منہ بولتی تصویر بن گئے ہیں۔ اور ظالم رفیقۂ حیات کا عالم یہ ہے کہ وہ کاغذ کے پرزے کے گم ہو جانے کے اندیشہ کے تحت دھوبی کے کپڑوں کا حساب کتاب بھی اپنے شوہرِ نامدار کی صاف

چندھیا پر لکھدی ہیں۔ میرے قریبی دوست ہونے کے ناطے انہوں نے ایک مرتبہ بادیدۂ نم مجھے اپنی چندھیا کا معائنہ بھی کرایا۔ ایک گوشہ میں دو دھوکی راتیں کی تفصیلات درج تھیں تو دوسرے کونہ میں کرانہ فروش کے بقایہ کا ایٹم بطور یادداشت لکھدیا گیا تھا۔ بیچ میں کھریا سے بچکانی خط میں انگریزی جملہ THIS.IS.AN.ASS بہار دکھا رہا تھا۔ میں نے جب صاحب چندھیا کو اس جانب توجہ دلائی تو قدرے جھینپ کر بولے " وہ میری چھوٹی نے لکھدیا ہوگا۔ کنڈرگارٹن میں پڑھتی ہے اور اپنا روز کا سبق اسطرح یاد کرلیتی ہے۔ میں سوچنے لگا کہ حضرت کتنے خوش قسمت ہیں۔ آجکل تو نرسری ہی سے بچوں کو ۸، ۸ کاپیاں دلانی پڑتی ہیں۔ اگر سر باپ کسی نہ کسی طرح تختی بن جائے تو کاپیوں کا یہ خرچ تو عائد نہ ہوگا۔

ایک اور کرم فرما ہیں۔ بڑے خوش لباس اور وضعدار لیکن ۵۰ فیصد گنجے۔ اپنے بچے کچے بالوں کو وہ کچھ اسطرح ترشواتے ہیں کہ سر پر کوئی بامعنی جملہ ابھر آئے۔ عیدآجائے تو اردو میں " عید مبارک " کی عبارت۔ کرسمس میں " سیزنز " پر انگریزی لفظا " ڈی GREETINGS" جگمگانے لگتا ہے۔ بالوں کی اس " بامعنیٰ ترمین " کی تکنک وہ کسی کو نہیں بتاتے اور نہ ہی اپنے اس آرٹسٹ کے نام سے روشناس کراتے ہیں جو اس تکنک کا ماہر ہے، ان کا کہنا ہے کہ یہ فن ہر " ٹام، ڈک اور ہیری " کے بس کی بات نہیں۔ ایک دفعہ تو میں نے ان کی چندیا پر حضرت غالب کو بھی براجمان دیکھا، وہ کئی دنوں تک اپنی چندیا پر ان کا شعر اٹھائے پھرتے رہے۔

بکھرے ہوئے ہیں گواہ عشق طلب
زلف کی کس سررشتہ داری ہے

اپنے گنجے پن پر ان تجربات کی روشنی میں غور کرتا ہوں تو مجھے یک گونہ سکون ہوتا ہے کہ اس گھنے جنگل میں جسے کائنات کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے ہم چند گنجے اجالوں کے نقیب بنے ہوئے ہیں۔ مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مخدوم نے اپنی ایک نظم میں " اندھیری رات میں مشعلوں کی برات " والا مصرعہ ہماری ہی چمکتی، جگمگاتی، چندیاؤں سے متاثر ہوکر کہا ہوگا۔

بڑے بزرگوں کا قول ہے کہ ' صاف چندیا ' دولت و اقبال، عہدہ اور مرتبہ کی نمائندگی کرتی ہے۔ یہ استثنائے خود میں نے بیشتر گنجوں کو فارغ البال، مسرور و مطمئن دیکھا ہے۔ اس گروہ " بے فکراں " میں میرے ایک قریبی دوست بھی شامل ہیں۔ وہ ایک پرائیویٹ اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہیں۔ دوپہر میں کچھ دیر کیلئے قیلولہ کرلینا، ان کی سب سے بڑی کمزوری ہے، لیکن اسی وقت طلبا کے سرپرست ڈسٹرب کیا کرتے ہیں۔ انہوں نے کمرہ پر " NO ADMISSION " کا بورڈ بھی لگوایا۔ لیکن دوسرے دن ہی شریر بچوں نے اسے نکال کر بیت الخلا کی دیوار پر آویزاں کردیا۔ ان کے قیلولہ کو پھر ایکبار خطرہ لاحق ہوگیا۔ انہوں نے کافی سوچ بچار کے بعد سرخ رنگ کی روشنائی میں اپنی چاندی کی طرح چمکتی چندیا پر NO ADMISSION کی عبارت ایک خوش نویس سے لکھوائی اور اب میز پر سر رکھ کر کچھ اس طرح مصروف قیلولہ ہوجاتے ہیں کہ . . . . . . " NO. ADMISSION " کا یہ بورڈ دور سے بہ آسانی دیکھا جاسکتا ہے، اس بورڈ کے سرقہ یا نقل مقام کا کوئی اندیشہ بھی نہیں ہے۔ اور اسی لئے قیلولہ کے ساتھ ساتھ ان کی ہیڈ ماسٹری بھی چل رہی ہے۔

گنجوں کو آپ کتنا ہی حقیر کیوں نہ سمجھیں، مجھے اس بات کا اندازہ ہوگیا ہے کہ ان کا عام طور پر کتنا احترام کیا جاتا ہے، چند دنوں پہلے کی بات ہے کہ میں اپنے پسندیدہ سیلون میں حسب معمول مصروف مطالعہ تھا کہ ایک گنجے بزرگوار داخل ہوئے اور حجام سے پوچھا کہ وہ ان کے بال کاٹنے کی اجرت کیا لے گا۔

دوکان کے بورڈ پر ہیر کٹنگ و شیونگ کا معاوضہ ڈیڑھ روپیہ درج تھا۔ لیکن حجام نے ان سے بہ تمام ادب عرض کیا۔ "حضور دو روپے لوں گا۔" آنے والے بزرگوار نے اس اثنا میں آویزاں نرخنامہ کا جائزہ لے لیا تھا۔ قدرے حیز بز ہوکر سوال کیا (۵۰) پیسے زائد کیوں؟ حجام نے پہلے سے زیادہ انکسار کے ساتھ عرض کیا۔ "سرکار! دوسروں کے بال تو صرف کاٹنے پڑتے ہیں۔ آپ کے بال کاٹنے سے پہلے تلاش بھی کرنے ہوں گے۔ اور یہ فاضل (۵۰) پیسے اسی تلاش کے لے رہا ہوں"۔ اگر آپ گراں بہ حکمت اور ارزاں تعلیت والے مقولہ پر ایمان رکھتے ہیں تو آپ کو مان لینا چاہیے کہ چند بالوں کو ترشوانے کا معاوضہ مقررہ معاوضہ سے زائد ہو ان کے حامل سر اور جسم بھی عام سروں اور جسموں کے مقابلہ میں زیادہ اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ گنجوں کو بھی نظر سے مت دیکھیے، کیونکہ کسی دن آپ کے سر پر بھی جھاڑو پھیر سکتی ہے۔ ان کی قدر و منزلت کو پہچانیے اور آئینہ دیکھکر ایمان سے کہیے کہ اس عالم میں آپ کتنے مقدس، کتنے محترم بن جائیں گے اور کسطرح دوسروں کے لئے آپ کی چندیا "نوشتہ دیوار" بن جائے گی۔

برق آشیانوی

مانگنا

ایک پرانی کہاوت ہے۔ "بنج کروں تو ٹوٹا آوے۔ کا ٹھ کھاوں تو بیتے۔ دادو رام جی یوں کر بولے، مانگ کھاتے سو جیتے۔" پتہ نہیں یہ دادو رام جی کون بزرگ تھے مگر بات بڑی پکی کہہ گئے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ دادو رام جی کے کسی چیلے نے ان سے پوچھا۔

"گرو جی اگر میں تجارت کرتا ہوں تو نقصان ہونے کا خوف ہے اور اگر چوری کرتا ہوں تو سزا ہو جانے کا ڈر ہے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ کیا کروں"۔ تو انھوں نے نہایت ہی حکیمانہ انداز میں جواب دیا۔ بیٹا! مانگ کھاؤ اور سو برس جیو"۔

یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ مانگ کھانے والے بڑے مزے میں رہتے ہیں۔ نہ کسی کے نوکر نہ چاکر۔ نہ غلام نہ تابعدار۔ بلکہ ہر ایک کے سر پر سوار۔ مانگ کھانے کی اس عام قسم پر تو بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ جس کو گداگری کہا جاتا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں اس فن کو آرٹ کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ لیکن ہمارے ملک میں ابھی اس کو وہ مقام نہیں ملا ہے اس لئے اس آرٹ کے نہ سند یافتہ بیچلر ملتے ہیں نہ ماسٹر۔ البتہ عملی طور پر اس فن کے ایسے ایسے ماہر موجود ہیں کہ بیچلر یا ماسٹر تو کجا اگر انہیں پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی دی جائے تو کم ہے۔ غرض اس عام قسم یعنے گداگری پر تو ہم کچھ کہنا نہیں چاہتے کیوں کہ پہلے ہی سے اس فن پر اتنا لٹریچر موجود ہے کہ اگر اس کو ہی کوئی پڑھ لے تو خود بھی ایسا ماہر ہو جائے کہ دوسرے ہی روز اپنا پیشہ چھوڑ چھاڑ کر اس پیشے کو اختیار کر لے اور کاسۂ گداگری لے کر گھر سے نکل پڑے۔ البتہ ہم مانگنے کی اُن اقسام کا ہی ذکر کریں گے۔ جن کو سوسائٹی میں مانگنا یا یوں کہیے کہ بھیک مانگنا نہیں کہا جاتا اور نہ ایسے مانگنے میں کسی کو شرم یا عار محسوس ہوتی ہے۔ بر خلاف اس کے بڑے ٹھاٹھ سے مانگا جاتا ہے۔ حکومت سے مانگا جاتا ہے بلکہ جبر و قہر سے مانگا جاتا ہے۔ لیکن ہوتا ہے یہ سب مانگنا ہی۔

سب سے پہلے ہم کتاب مانگنے کو لیتے ہیں۔ اس کے متعلق بھی ایک پرانا مقولہ ہے کہ "کتاب دینے والا بیوقوف ہوتا ہے اور کتاب لے کر واپس کرنے والا اس سے بڑا بیوقوف ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک لطیفہ مشہور ہے۔ کسی بادشاہ نے اپنے وزیر کو بے وقوفوں کی ایک فہرست تیار کرنے کا حکم دیا

وزیر نے فہرست تیار کی اور بادشاہ کے حضور میں پیش کی تو کیا دیکھتے ہیں کہ سرِ فہرست خود بادشاہ جہاں پناہ کا نام درج ہے، عالم پناہ بہت غضبناک ہوئے لیکن ضبط سے کام لے کر پوچھا۔ "یہ کیا تم نے تو ہمارا نام ہی سرِ فہرست لکھ دیا ہے؟ وزیر نے جواب دیا۔ "عالم پناہ نے شہر کے قاضی کو اپنی کتاب عنایت فرمائی۔ چونکہ کسی کو کتاب دینے والا دنیا میں سب سے بڑا بیوقوف ہوتا ہے۔ اس لئے میں نے عالم پناہ کا نام سرِ فہرست لکھ دیا۔" عالم پناہ نے دریافت فرمایا۔ "اگر قاضی نے ہمیں کتاب واپس کر دی تو ۔۔۔؟" وزیر نے جواب دیا۔ "تو پھر عالم پناہ کے نام کے اوپر قاضی کا نام لکھ دیا جائے گا۔"

اس کہانی میں کوئی حقیقت ہے یا نہیں، لیکن اس مقولہ میں اتنی صداقت ہے کہ ہر کتاب دینے والا اس پر صدقِ دل سے ایمان لاتا ہے۔ یہ بات تو اس زمانے کی ہے جبکہ صرف کتاب وجود میں آئی تھی۔ اخباروں نے جنم نہیں لیا تھا۔ اور رسالے پیدا نہیں ہوئے تھے۔ اب جبکہ اخبارات اور رسائل نے بھی جنم لینا شروع کر دیا ہے اور اس زور و شور سے جنم لے رہے ہیں کہ ہمیں اندیشہ ہے کہ کہیں آگے چل کر اخبارات و رسائل کی پیدائش کی روک تھام کے لئے ایک خاص قسم کی فیملی پلاننگ اسکیم نہ بنانی پڑے۔ اور ان کی پیدائش کے خلاف بھی کچھ اس قسم کا نعرہ نہ لگانا پڑے۔

"اگلا اخبار ابھی نہیں، دو کے بعد کبھی نہیں۔"

جب یہ بات ہمارے ایک دوست نے سنی تو فرمایا۔ "بھائی صاحب! آپ کا خیال غلط ہے۔ اخبارات و رسائل کے سلسلہ میں ایسی نوبت نہ آئے گی۔ آپ اطمینان رکھیں۔ اسلئے کہ جس رفتار سے ان کی پیدائش ہو رہی ہے اس سے زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ انسانوں کی پیداوار ہو رہی ہے۔ چنانچہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ اتنے اخبارات اور رسائل نکل جانے کے باوجود کسی اخبار یا رسالے کی ایک ایک کاپی کو سو سو یا دو دو سو آدمی پڑھتے ہیں۔" یہ بات ہماری سمجھ میں آسانی سے آگئی اسلئے کہ کل ہی اخبار کے ایجنٹ نے ہمیں اخبار دینا چاہا تو ہمارے پڑوسی نے جو ہم سے باتیں کرتے کھڑے تھے ہاتھ بڑھا کر خود اخبار لے لیا اور اسطرح اخبار پڑھنا شروع کیا کہ ہمیں اپنا عدم اور وجود دونوں برابر نظر آنے لگے۔ آخر میں جب ہم نے اپنا اخبار مانگا تو انہوں نے ہمیں گھور کر دیکھا اور کہا۔"ابھی پڑھا ہی نہیں اور آپ مانگ رہے ہیں۔ لیجئے صاحب، مانگنے کا الزام ہم پر ہی آگیا۔ اس کے بعد تیزی کے ساتھ وہ اخبار لئے اپنے گھر میں چلے گئے۔ اب ہم کس کا منھ دیکھتے کھڑے رہتے چنانچہ اپنا سا منھ لے کر اپنے گھر میں داخل ہوئے۔ دفتر جاکر واپس آنے کے بعد اخبار منگوایا تو بتایا گیا کہ ان کے پڑوسی کے پاس ہے۔ پھر جو پڑوسی در پڑوسی کا سلسلہ شروع ہوا تو پتہ چلا کہ تیسویں پڑوسی کے پاس اخبار پہنچ چکا ہے۔ جب ان تیسویں صاحب سے اخبار منگوایا گیا تو جواب ملا کہ۔" اخبار پڑھنا ہے تو خرید کر پڑھا کریں۔ مانگ کر پڑھنے کی عادت اچھی نہیں۔"

یہ ایک مثال تو ہم نے اخبار کی دے دی۔ یہی حال رسائل کتب کا بھی ہے۔ کوئی رسالہ گھر میں آتا ہے تو ایک بار نظر آتا ہے، دوسری بار نظر نہیں آتا۔ اور آخر میں ہم یہ کہتے رہ جاتے ہیں کہ" ایک بار دیکھا ہے، دوسری بار دیکھنے کی ہوس ہے۔" اگر کبھی اتفاق سے پتہ چل گیا کہ رسالہ کہاں ہے تو منگوانے پر وہی جواب ملتا ہے کہ" مانگ کر پڑھنا اچھا نہیں خرید کر پڑھا کریں۔" چنانچہ ہم نے خرید کر پڑھنا چھوڑ دیا ہے اور مانگ کر پڑھنے لگے ہیں۔ اور لوگوں کو سختی کے ساتھ کہنا شروع کر دیا ہے کہ" مانگ کر پڑھنے کی عادت اچھی نہیں خرید کر پڑھا کریں۔"

مانگنے سے متعلق ایک اور مثل مشہور ہے کہ دنیا میں کوئی

چیز بغیر مانگے نہیں ملتی۔ ماں اپنے بچے کو بغیر مانگے دودھ نہیں پلاتی۔ باپ اپنے بچے کو بغیر مانگے اسکول کی فیس نہیں دیتا۔ شوہر بیوی کو بغیر مانگے اپنی تنخواہ نہیں دیتا اور جب دیتا ہے تو اضافہ گرانی الونس نکال لیتا ہے جس کا علم اکثر بیوی کو نہیں ہوتا ہے۔ بیوی بغیر مانگے شوہر کو بس کا کرایہ نہیں دیتی۔ بنیا گاہک کو بغیر مانگے ادھار نہیں دیتا۔ گاہک بنیے کو بغیر مانگے قرض ادا نہیں کرتا۔ مریض ڈاکٹر کو بغیر مانگے فیس نہیں دیتا۔ دفتر سے بغیر مانگے رخصت نہیں ملتی۔ خدا بغیر مانگے اپنے بندوں کو جنت اور حوریں نہیں دیتا۔ حتیٰ کہ بندے بھی خدا کو بغیر مانگے اپنے گناہوں کا حساب نہیں دیتے۔ اس کے ثبوت میں مرزا غالب کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیے۔

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

انسان کو اپنی سماجی زندگی میں اور کئی مواقع مانگنے کے آتے ہیں۔ کسی نوجوان لڑکے کو بغیر مانگے لڑکی نہیں ملتی۔ معاف فرمائیے۔ اب یہ بات غلط ہوگئی ہے بلکہ الٹی ہوگئی ہے۔ اور اب یوں کہنا چاہئے کہ کسی لڑکی کو بغیر مانگے لڑکا نہیں ملتا۔ اور لڑکے کو بغیر مانگے جوڑے کی رقم نہیں ملتی۔

آجکل مانگنے کا سلسلہ اتنی ترقی پر ہے کہ مانگنا زندگی کا جزوِ لازم ہو کر رہ گیا ہے۔ اخبارات میں روزانہ ایک نہ ایک خبر مانگنے کی پڑھنے میں آتی ہے۔ لطف کی بات تو یہ ہے کہ اب مانگنے کے لفظ پر ایک سنہری غلاف چڑھا کر اس کا نام مطالبہ یا مطالبات رکھ دیا گیا ہے۔ چنانچہ کوئی دن ایسا نہیں گذرتا کہ اخبار میں کسی نہ کسی قسم کی مانگ "عرف" مطالبے کی خبر درج نہ ہو۔ مانگنے کے طریقے بھی نئے نئے وجود میں آگئے ہیں۔ کہیں گھیراؤ کر کے مانگا جا رہا ہے، کہیں پتھراؤ کر کے مانگا جا رہا ہے۔ کہیں توڑ پھوڑ کر کے مانگا جا رہا ہے۔ کہیں عجز و انکسار سے مانگا جا رہا ہے، کہیں جبر و اختیار سے مانگا جا رہا ہے۔ کوئی ان مانگنے والوں کی مانگیں پوری کرنے کا وعدہ کر کے ان سے ووٹ مانگ رہا ہے۔ . . . .

ووٹ مل جانے کے بعد جب ان کی مانگیں پوری نہیں کرتا تو ان سے معافی مانگ لیتا ہے۔

ابھی اور بہت ساری قسمیں مانگنے کی ہیں جن کا ذکر اس مختصر سے مضمون میں ممکن نہیں ہے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ جتنی قسمیں ہم نے مانگنے کی بیان کی ہیں ان میں ہر ایک ایسی ہے کہ اس پر علیحدہ علیحدہ ایک مضمون ہی نہیں بلکہ کتاب لکھی جا سکتی ہے۔

آخر میں ہم مانگنے کی ایک دلچسپ قسم کا ذکر کر کے رخصت ہوتے ہیں۔ اور وہ ہے چندہ مانگنا۔

مانگنے کی یہ قسم اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ لوگوں کو اب چندہ کے نام سے وحشت ہونے لگی ہے۔ چندہ مانگنے والے بھی چند خاص ہی لوگ ہوتے ہیں۔ یہ ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ بلکہ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ یہ فن بھیک مانگنے سے بدرجہا مشکل ہے۔ چندہ مانگنے والے لوگوں سے لوگ پناہ مانگنے لگتے ہیں۔ چنانچہ ادھر چندہ مانگنے والے کی صورت نظر آئی اور ادھر دینے والے کی روح قفس میں تحلیل ہونا شروع ہوئی۔ لیکن ایک ماہرِ فن ایسے انداز میں چندہ وصول کر لیتا ہے کہ سانپ بھی مرے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ چنانچہ یہ لوگ کئی سانپ مارتے ہیں لیکن ان کی لاٹھی نہیں ٹوٹتی۔

مطلب یہ کہ بغیر کسی خطرے کے یہ لوگ چندہ وصول کر لیتے ہیں۔ لیجئے اب میں بھی اجازت مانگتا ہوں۔ خدا حافظ! —

lo.

Registered with the Registrar of News Paper Registered No. 8285/64

MAY
1971

POONAM URDU MONTHLY

n-Residence :
i2957

Editor : NASIR KURNOOLI

AZAMPURA
HYDERABAD-24

ادبی ٹرسٹ کے چوتھے کل ہند مشاعرہ کا ایک منظر



صدر مشاعرہ علامہ حیرت بدایونی کلام سنا رہے ہیں ۔